فیروز الدین احمد فریدی

فرید الدین مسعود
گنج شکرؒ
کی ایک جھلک

فیروز الدین احمد فریدی

ISBN 969-8235-04-3

پہلا ایڈیشن	1995ء
دوسرا ایڈیشن	1996ء
تیسرا ایڈیشن	1997ء
چوتھا ایڈیشن	1998ء
پانچواں ایڈیشن	2000ء

ناشر: فاطمہ پبلی کیشنز

کھتوال ہاؤس

A-54، سٹریٹ 15

باتھ آئی لینڈ، کراچی 75530

ای میل: faridis@khi.compol.com

مطبع: ایجوکیشنل پریس

683۔ادب منزل، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد روڈ

پاکستان چوک، کراچی 74200

قیمت:

اندرونِ ملک: اسی (80) روپے

بیرونِ ملک: پانچ (5) ڈالر

اِس حقیر کاوش کو

فریدالدین مسعود گنج شکرؒ

سے منسوب کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ ع

گر قبول اُفتد زہے عِزّ و شرَف
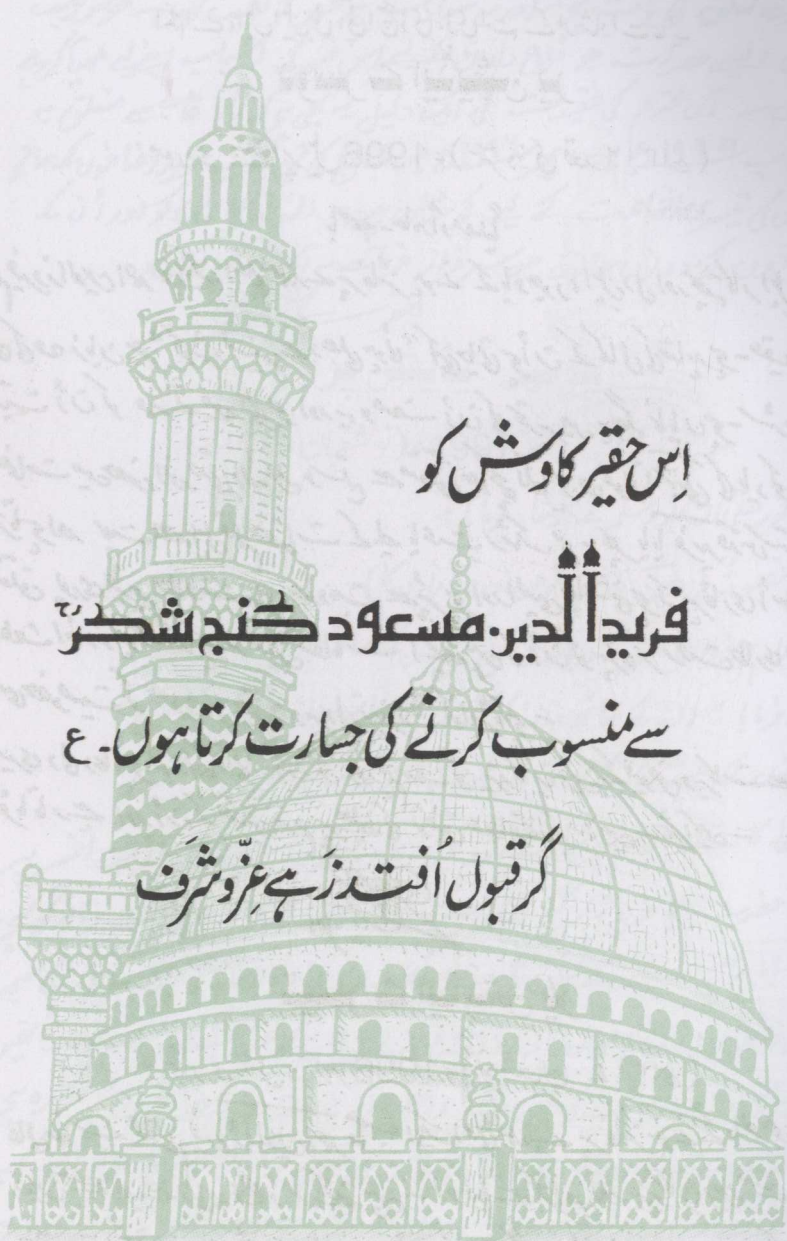
دوسرے، تیسرے اور چوتھے ایڈیشنوں پر

پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب قدس سرہ

ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ کے ارشادات عالیہ

دوسرے ایڈیشن پر

مورخہ چھے اپریل 1996ء (سترہ ذی قعد ۱۴۱۶ھ)

باسمہٖ حامداً و مصلیاً

محترم فیروزالدین احمد، ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کے باوجود، اہلِ دل اور پختہ کار اہلِ قلم ہیں، دہلی کی وہ زبان جو "کوثر و تسنیم سے دُھلی ہوئی" کہی جاتی ہے اُن کے کمال کی شاہد ہے۔ عقیدت اور محبت اُن کو ورثے میں ملی ہے اور یہ وصف اُن کی تحریر میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ شروع کے صفحات میں حضور انور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ مولانا شبلی کی یاد کو تازہ کرتا ہے اور بہت سے اہلِ قلم حضرات کے لیے باعثِ رشک ہے، پھر بابا فرید قدس سرہ سے متعلق پوری تحریر حلاوت اور عذوبت سے پُر ہے اور ایسی چاشنی ہے کہ ہر قاری اُس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے، بعض مقامات ایسے ہیں کہ اُن کو پڑھ کر رقّت طاری ہو جاتی ہے، اسی خصوصیت کو "از دل خیزد و بر دل ریزد" کہا جاتا ہے۔

میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اور ہم سب کو بزرگانِ دین کے فیوض و برکات سے بہرہ ور فرماتا رہے اور اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ ثم آمین۔

فقط
[signature]
احقر

تیسرے ایڈیشن پر

مورخہ بیس دسمبر 1996ء (نو شعبان ۱۴۱۷ھ)

عالی جناب محترم فیروزالدین احمد صاحب ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کے باوجود، دین سے بہت زیادہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ اولیائے کرام اور بزرگانِ دین سے عقیدت انھیں ورثے میں ملی ہے۔ اُن کے بزرگوں نے عقیدت میں بہت کچھ لکھا تھا اور بہت کچھ فیض حاصل کیا تھا، آں محترم بھی اسی تعلق سے مستفیض ہیں۔ پھر حضرت بابا فرید شکر گنج قدس سرہ سے انھیں جو عقیدت ہے

وہ قابلِ رشک ہے۔ بار بار پاک پتن شریف حاضر ہونا، وہاں کے غریبوں کی
مالی امداد کرنا، وہاں کے زائرین کے لیے حتی الامکان سہولت پہنچانا بہت
بڑے تعلق کی بات ہے۔ اور یہ سعادت ہر شخص کو نصیب نہیں۔ خوش نصیب
ہیں ایسے حضرات جو فلاحِ دارین کے لیے اس قسم کے اسباب اپنے لیے مہیا کر رہے
ہیں۔ آں محترم کی عقیدت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ بابا صاحبؒ سے متعلق یہ
کتاب ۱۹۹۵ء میں، پھر ۱۹۹۶ء میں شائع کی تھی۔ اب مزید اضافوں کے ساتھ
اس کی تیسری اشاعت کے لیے کوشاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اور اُن کے
عزیزوں کو دونوں جہانوں میں سرفراز فرمائے۔ آمین ثم آمین

احقر

چوتھے ایڈیشن پر

مورخہ دس دسمبر 1997ء (نو شعبان ۱۴۱۸ھ)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

الدینُ نصیحۃٌ (دین نام ہے خلوص اور وفاداری کا)

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا "کس کے ساتھ؟"

ارشاد فرمایا " اللہ کے ساتھ، اللہ کی کتاب کے ساتھ، اللہ کے رسول کے ساتھ،
مسلمانوں کے پیشواؤں کے ساتھ اور اُن کے عوام کے ساتھ"۔

اللہ تعالیٰ کا بے حد انعام ہے ہمارے محترم فیروز الدین احمد صاحب جیسے عظیم المرتبت افسر پر
جن کو حضرت بابا فرید شکر گنج قدس سرہ سے والہانہ عقیدت، ودیعت فرمائی گئی ہے۔
چنانچہ بابا صاحبؒ اور اُن کے تعلق کی ہر چیز اُنھیں عزیز ہے۔ بابا صاحبؒ کی بارگاہ، اُن کی مسجد،
اُن کی خانقاہ، اُن کا مہمان خانہ، اُن کے مہمان بلکہ اُن کے عقیدت مند سب کے سب اُنھیں
محبوب ہیں۔ اور ان سب کی خدمت "دامے، درمے، قدمے، سخنے" اُن کا وطیرہ ہے۔
اسی جذبے سے سرشار ہو کر انھوں نے بابا صاحبؒ سے متعلق یہ کتاب بارہا شائع کی ہے، اب بھی
شائع کر رہے ہیں اور ان شاء اللہ آئندہ بھی شائع کریں گے۔ ع از بہر تو میرم، زبرائے تو زیم
بے حد خوش قسمت ہے ہمارے محترم جو محولہ بالا حدیث کے مطابق اپنے لیے دونوں جہانوں کی
سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

دعاگو، دعاجو

ترتیب

حرفِ چند
۱
وَرَفَعنَا لَکَ ذِکرَکَ
۵
فریدالدین مسعود گنجِ شکرؒ
۱۱
اگست کے پھول
۷۴
تبصرے
۸۳
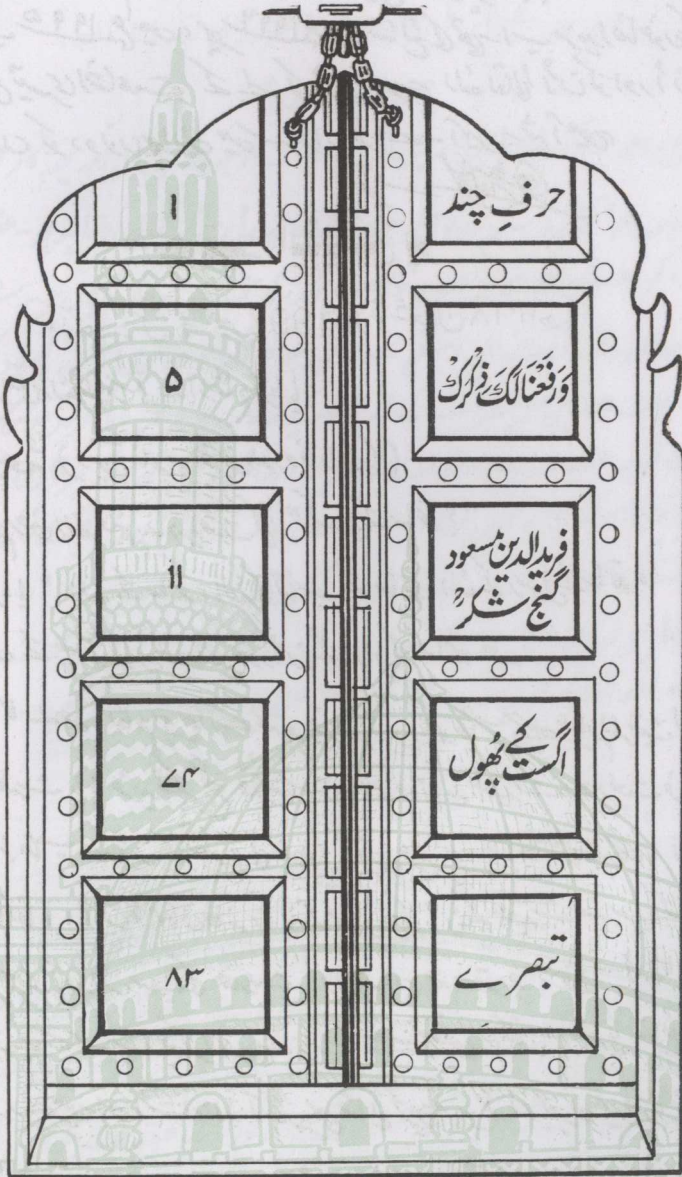
حرفِ چند

فرید الدین مسعود پاکستان کے حقیقی بانی ہیں۔ انہوں نے اپنی سوز و درد سے بھری ہوئی نوے سالہ زندگی کے آخری بیس پچیس برس، حکمِ الٰہی کے تحت، اجودھن میں بسر کیے جو قیامِ مسعود کی برکت سے اب پاک پتن کہلاتا ہے اور لاہور کے جنوب مشرق میں دو سو کلومیٹر اور ملتان کے شمال مشرق میں دو سو پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

پتن مقامی زبان میں کنارے کو کہتے ہیں۔ اجودھن اس زمانے میں دریائے ستلج کے کنارے پر تھا جو اب وہاں سے کوئی بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، دریا کے ایک طرف بھارت اور دوسری جانب پاکستان ہے۔ ان کے چوتھائی صدی کے قیام کے دوران، اس پورے علاقے میں آباد ہندوؤں کے اتنے بڑے بڑے قبائل ان کے ہاتھ پر اسلام لائے اور بعد میں مغربی پنجاب میں اتنی دور دور تک پھیلے کہ یہ وسیع و عریض علاقہ، جو اس زمانے میں زیادہ تر صحراؤں اور جنگلوں پر مشتمل تھا، ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کی اکثریت کا خطہ ہوگیا۔ یہی عددی اکثریت، سات صدیوں بعد، ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کی واحد بنیاد بنی۔ اس طرح قیامِ مسعود اور قیامِ پاکستان میں باپ بیٹے والا رشتہ، اور پاک پتن اور پاکستان میں ایک گہرا تاریخی اور جذباتی تعلق ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ قرونِ اولیٰ میں اسلام کو پھیلانے کا جو اعزاز امیر المومنین عمر فاروقؓ کے نصیب میں آیا تھا، وہ اَزمنۂ وسطیٰ میں، امیر المومنین کی نسل میں پیدا ہونے والے اس خدا دوست اور انسان دوست درویش کو اس برِ صغیر میں عطا کیا گیا۔

فرید الدین مسعود، اللہ کے دوست تھے اور یہ دوستی اس مقام پر پہنچ گئی تھی جہاں وہ اللہ کے کانوں سے سنتے، اللہ کی آنکھوں سے دیکھتے، اللہ کے ہاتھ سے پکڑتے اور اللہ کے پاؤں سے چلتے تھے۔ ان کے لیے افلاک سے ندا آئی تھی کہ وہ وحیدِ عصر ہوں گے۔

ان کے لیے خواجہ معین الدین چشتی سے کہلوایا گیا تھا کہ ان سے درویشی کا سلسلہ سدا روشن رہے گا۔ وہ کلمہ گووٴں کے سردار اور اللہ کی ایک آیت ہیں۔

فرید الدین مسعود اللہ کے بندوں کے بھی دوست تھے۔ ان کا عمر بھر عام آدمی سے گہرا تعلق رہا۔ ان کا دل صرف عوام کے لیے نہیں بلکہ عوام کے دلوں کے ساتھ دھڑکتا تھا۔ جب وہ اس خشک، بنجر، گرم اور ریتیلے علاقے میں رہنے والوں سے بات چیت کرتے تو وہ نہ فارسی میں ہوتی جو ان کی مادری زبان تھی، نہ عربی میں جو ان کے حرمِ علم کی کنیز تھی، بلکہ وہ ان لوگوں کی اپنی زبان، یعنی قدیم ملتانی زبان، میں ہوتی۔ بہت سے محققین کی رائے میں وہ اس برِ صغیر کی قدیم زبان یعنی ملتانی اور جدید زبان یعنی اُردو، دونوں کے سب سے پہلے مستند شاعر ہیں اور ان محققین میں ہندو، مسلم، سکھ سبھی شامل ہیں۔ سکھ تو ان سے منسوب اشعار کی، جو سکھوں کی مقدس کتاب گرنتھ صاحب میں ہیں، ویسی ہی تعظیم کرتے ہیں جیسی مسلمان قرآنی آیات کی کرتے ہیں۔

صوفیائے عظاّم نے، اِس برِ صغیر میں، ہر قسم کی مشکلوں اور مخالفتوں کے باوجود، اللہ کا پیغام جس طرح یہاں کی مقامی غیر مسلم آبادی تک پہنچایا، وہ کسی طرح جہادِ فی سبیل اللہ سے کم نہیں۔ ان صوفیائے کرام میں سلسلہٴ چشت کے بزرگوں کو خاص مقام حاصل ہے۔ اس ممتاز سلسلے کے پانچ عظیم ولیوں میں سے چار ہندوستان میں آسودہٴ خواب ہیں۔ پاکستان کی یہ خوش نصیبی ہے کہ قدرت نے فرید الدین مسعود کی خاک کو ہماری آنکھوں کا سرمہ بنایا ہے لیکن یہ خوش بختی ملنے کے بعد اسے اپنی بدبختی نہ کہیں تو کیا کہیں کہ جس نور سے ایک عالم کو بصیرت ملی، ہم نے اسے روایات کی گرہوں میں باندھ کر، اپنی بصارت پر بھی پردے ڈال دیئے، جن کے پیچھے ہم درویشی کی اس شمع کے نور کی ایک جھلک دیکھنے سے محروم ہو گئے۔

اس حقیر کاوش کا مقصد اللہ اور اللہ کے بندوں کے اس سچے دوست کا جو بارھویں صدی عیسوی میں یہاں بھیجا اور تیرھویں صدی عیسوی میں واپس بلا لیا گیا، ایک انسان کی حیثیت سے اکیسویں صدی عیسوی کے انسان سے تعارف کرانا اور اس کی ہلکی سی جھلک

دکھانا ہے۔ اس میں بعض ایسے حقائق واضح کیے گئے ہیں جن کا علم شاید کم لوگوں کو ہوگا اور بعض ایسی باتیں یکجا کر دی گئی ہیں جو اکیسویں صدی کا انسان ان کے بارے میں جاننا چاہے گا۔ یہ اس عظیم درویش کا ایک ادھورا قلمی خاکہ ہے۔ اس کے نامکمل ہونے کی تین وجوہات ہیں: اولاً میری کم علمی جس کا شناسا مجھ سے زیادہ کون ہوگا۔ ثانیاً موضوعِ تحریر کی آفاقیت اور بے کراں وسعت جس کی گواہی زمانہ اور تاریخ سات صدیوں سے مسلسل دے رہے ہیں اور جس کے پس منظر میں میری جسارت کی مثال کچھ ایسی ہی ہے جیسے کوئی بازو بریدہ پگلا سقّہ ایک ذخاّر سمندر کا سارا پانی اپنے تار تار سینہ فگار مشکیزے میں بھر لینے کی ضد کر کے ساحلِ سمندر پر سینہ ٹھونک کر کھڑا ہو جائے۔ اس کے باوجود اسے سمندر سے جو بھی مل جائے وہ سمندر کی رزاّقی نہیں تو کیا ہے۔ ثالثاً سات آٹھ صدیاں بیتنے کے بعد ایسی مصدقہ تفصیلات کی عدم دستیابی جو بانیٔ پاکستان کی پہلو دار شخصیت کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہوں جو ریاضت اور روحانی کرامات سے ہٹ کر ہمیں ان کی روزمرّہ زندگی اور ان کی علمی اور سماجی دلچسپیوں سے آگاہ کرتی ہوں۔

ان تمام داخلی اور خارجی مجبوریوں کے باوجود اس جسارت کا کیا کیجیے جو، چاہت کا بہانہ بنا کر، اپنی کم علمی اور گستاخی پر الفاظ کے سیاہ نقاب ڈالے، اس کتابچے کے اوراق میں چھپ کر، آپ کے سامنے نظریں جھکائے کھڑی ہے۔ اللہ کے فضل و کرم اور فرید الدین مسعود کی نظر کرم کی بدولت ۱۹۹۵ء سے اس کتابچے کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، اکیسویں صدی کی آمد پر یہ پانچواں ایڈیشن ہے۔ ان ایڈیشنوں میں تحقیق، تدوین، تصحیح، کتابت، اشاعت اور انہیں فرید الدین مسعود کے پرستاروں کے ہاتھوں تک پہنچانے کے مراحل میں اللہ کے جن نیک بندوں نے خود آگے بڑھ کر میرا ہاتھ بٹایا، ان کے لیے میں صرف دعائے خیر ہی کر سکتا ہوں۔ ان کا فرداً فرداً نام لینا ممکن نہیں۔ تاہم چند ناموں کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میرے چھوٹے بھائی پروفیسر جاوید احمد فریدی نے اوچ، کوتھے وال اور ملتان میں واقع بعض تاریخی مقامات تک پہنچانے میں میری امداد بلکہ رہنمائی کی۔ جناب محمد نسیم شاہ اور جناب راغبؔ مراد آبادی نے پہلے ایڈیشن (۱۹۹۵ء) کی

تدوین اور تصحیح میں میری خصوصی مدد کی۔ پانچویں ایڈیشن (۲۰۰۰ء) کے لیے یہی خصوصی امداد بلکہ رہنمائی پروفیسر ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب مدظلہ سے ملی۔ اللہ انہیں اس کی جزائے خیر دے۔ جس بابرکت ہستی کا میں سب سے زیادہ ممنون ہوں وہ ہیں: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب قدس سرہ۔ میں ان سے پہلی بار ۱۲ ربیع الاول ۱۴۱۶ھ، مطابق دس اگست ۱۹۹۵ء کو ملا اور اس کتابچے کا پہلا طبع شدہ ایڈیشن پیش کر کے رہنمائی کا طالب ہوا۔ اللہ کے اس دوست نے اپنی پیرانہ سالی، عدیم الفرصتی اور کم زوری کے باوجود، ایک دو روز میں، اس کتابچے کے پہلے ایڈیشن کا ایک ایک لفظ، بلکہ ایک ایک حرف، انتہائی محنت اور کمال محبت سے پڑھ کر، ایک ایک شوشے اور نقطے کی جس عرق ریزی سے اصلاح کی اور کتابچے کے متن کے بارے میں مجھے جن بیش بہا مشوروں سے نوازا، میں ان کا شکریہ ادا کرنے سے اس لیے قاصر ہوں کہ شکریے کے مناسب الفاظ کسی لغت میں موجود نہیں پاتا۔ اس محنت اور محبت کا صلہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب قدس سرہ، کو وہیں سے ملے گا جہاں سے انہیں ہمیشہ ملتا رہا ہے۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہمیں ''دورِ غلامِ مصطفیٰ'' دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

منزل پانے کا عزم لے کر تو سبھی چلتے ہیں لیکن منزل ملتی صرف چند خوش نصیبوں کو ہے۔ ہر مقصد ہمیشہ حاصل ہوا ہے، نہ ہر کوشش سدا کامیاب ہوئی ہے۔ تاہم اگر یہ حقیر سی کوشش کبھی کچھ کامیاب ہوئی اور یہ اَرفع مقصد کہیں کسی حد تک حاصل ہوا تو وہ طفیل ہوگا اس وحیدِ عصر کی شرفِ قبولیت کا جس کے روضے کو اس ہستیؐ نے نوازا ہے جس کے تلووں تلے عرش کا آنا معراج اور سراج کہلایا ؎

کس ندانست کہ منزل گہِ مقصود کُجا ست
این قدر ہست کہ بانگِ جَرَسے می آید

ترجمہ: ''کوئی نہیں جانتا کہ منزلِ مقصود کہاں ہے۔ بس اتنا ہے کہ گھڑیال کی ایک آواز ہے جو لگاتار چلی آ رہی ہے۔''

۱۲/ربیع الاول ۱۴۲۱ھ

۱۶/جون ۲۰۰۰ء

فیروز الامین احمد فریدی

29 اکتوبر 1937ء (23 شعبان 1456ھ) کو دلّی میں پیدا ہوئے۔ کراچی یونیورسٹی سے بی کام، ایم اے (معاشیات) اور ایل ایل بی، ہارورڈ یونیورسٹی سے ایم پی اے اور قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم ایس سی کیا۔ 1962ء میں سول سروس میں آئے اور اکتوبر 1998ء میں وفاقی حکومت کے سب سے سینیئر ایڈیشنل سکریڑی کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ان کے اردو مضامین پچھلی نصف صدی اور انگریزی مضامین پچھلے چالیس برس سے پاکستان کے ممتاز روزناموں اور جریدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ وہ اردو کی دو اور انگریزی کی ایک کتاب کے مصنف ہیں۔

انسان تو انسان، دشوار گذار پہاڑوں کے جن غاروں میں قیام کیا، انہیں بھی نہ صرف
شہرتِ لازوال عطا کی بلکہ زیارت گاہِ خاص و عام بنا دیا۔ ان کی اگر کوئی صفت ہے تو صرف
اور صرف یہ کہ ایک یتیم بچےؐ نے یہ دور افتادہ غار، ایک خاص وقت میں، اپنے قیام کے لیے
چنے، اور اسی انتخاب نے کسی بے نام غار کو حرا، اور کسی بے نور غار کو ثور کا نام دے کر رہتی دنیا
تک ان کا نام کر دیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب غارِ حرا میں داخل ہوئے تو محمد بن عبداللہ
تھے۔ جب نکلے تو محمدؐ رسول اللہ تھے۔

''وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ''

ان سطور کی ابتداء، ایک عاشقِ رسول ﷺ کے ایک خط کے چند الفاظ سے ہے، جو پچھلی صدی کی تیسری دہائی کے آغاز میں لکھا گیا۔ یہ صاحب، بحری جہاز میں، ہندوستان سے انگلستان جا رہے تھے۔ مہینا ستمبر کا تھا، سال ۱۹۳۱ء۔ جب جہاز عدن کے قریب پہنچا اور بحیرۂ عرب کی نرم موجوں پر تیرتی ہوئی ان کی نظر پہلی بار جزیرہ نمائے عرب کی زمین پر پڑی تو قلب میں طوفان بپا ہو گیا اور جس طرح صدف کے منہ میں قطرۂ آب ٹپک کر گہر آب دار بن جاتا ہے، ان کے قلم سے یہ ۴۳/الفاظ، یکے بعد دیگرے، موتیوں کی مانند ٹپکے اور انمول ہو گئے:

''اے عرب کی سرزمین! تو ایک پتھر تھی جسے دُنیا کے معماروں نے رَد کر دیا تھا، مگر ایک یتیم بچے ﷺ نے خدا جانے تجھ پر کیا اَفسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دُنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔''

یہ مختصر، سیدھے سادے، دل نشیں الفاظ نہ صرف عشق و عقیدت سے شرابور ہیں بلکہ تاریخ کی ایک لازوال حقیقت کے ترجمان بھی ہیں۔ ان لازوال الفاظ کے مرتب و معمار کا نام تھا: محمد اقبال۔

دُنیا میں کم لوگ ایسے گزرے ہیں جنہیں مہد سے لحد تک اتنے مصائب، مشکلات اور مہمات کا سامنا کرنا پڑا ہو، جو محمد ﷺ کو اپنی مختصر دُنیاوی زندگی میں پیش آئیں جو قمری تقویم کے حساب سے ۶۳ اور عیسوی کیلنڈر کے مطابق ۶۱ برسوں پر محیط رہی۔ ماں کے پیٹ میں تھے کہ باپ چل بسے۔ چھے برس کے ہوئے تھے کہ ماں کی گود سے محروم

ہو گئے۔ نو برس کے تھے کہ سرپرست دادا اللہ کو پیارے ہوئے۔ چچا کی سرپرستی میں آئے تو چچا کی مالی حالت پہلے ہی سے زبوں تھی اور اِس طرح دُنیا کا یہ عظیم ترین انسان ﷺ جس سے ربِ ذوالجلال کو رہتی دُنیا تک انسانوں کی گلہ بانی کا کام لینا تھا، مکے کے گرد واقع جھلسی ہوئی سیاہ پہاڑیوں، خشک ٹیلوں اور گرم صحراؤں میں مویشیوں کی گلہ بانی کرتا رہا۔ ان حالات میں جنم لینے والے گم نامی میں پیدا ہوتے، گم نامی میں زندگی کی سانسیں پوری کرتے، اور گم نامی میں مرجاتے ہیں، اور ان کی موت کے چند برس، بلکہ بعض اوقات چند ماہ، بعد خود ان کی اپنی اولاد بھی انہیں بھولنے لگتی ہے، لیکن مکے کے اس یتیم بچے ﷺ کے لیے لوحِ محفوظ میں درج تھا:

"وَرَفَعنَالَكَ ذِكرَكَ" "ہم نے تمہارا ذکر بلند کیا۔"

یہ اللہ کا حکم تھا جو آسمانوں پر لکھا ہوا تھا اور وقت آنے پر، جب اس حکم اور فیصلے کا اعلان، عرب کی زمین پر، ایک ایسے انسان ﷺ کی زبان سے کرایا گیا جو رسمی تعلیم سے محروم تھا تو وہ وقت اس انسان ﷺ کی ٦١ سالہ زندگی کا سخت ترین دور تھا۔ دوست چند، مخالف دو چند اور مصائب دہ چند۔ اس وقت ان مٹھی بھر دوستوں کو چھوڑ کر باقی سب نے یہی سوچا، یا کہا، ہوگا کہ لوسنا تم نے! کیسی ناقابلِ یقین بات کہی جارہی ہے، لیکن جب صاحبِ کن فیکون ایک بار حکم دیتا ہے کہ "ہوجا" تو انہونی باتیں آناً فاناً ہوجاتی ہیں۔ چند برسوں میں یہ ناقابلِ یقین بات حقیقت بن گئی اور وہ ذکر جو عقبہ کی گھاٹیوں اور فاران کی چوٹیوں سے بلند ہوا تھا پورے جزیرہ نمائے عرب پر چھا گیا۔ سال صدیاں بنتے گئے۔ آج چودہ صدیاں بیت چکی ہیں۔ میں نے اپنے گناہ گار کانوں سے آسٹریلیا کے مغربی ساحل پر بھی یہ ذکر بلند ہوتے سنا۔ سوئٹزرلینڈ کے برف پوش پہاڑوں کے دامن میں بھی انسانوں کو یہ گواہی دیتے اور پہاڑوں کو اسے دہراتے سنا۔ افریقہ کے ریگ زاروں، انگلستان کے سبزہ زاروں، سپین کے کلیساؤں اور امریکہ کی وسعتوں میں بھی اس پاک ذکر کو اپنی پوری رعنائیوں سے جلوہ گر دیکھا۔ بھلا اس بندے ﷺ کے ذکر کی

رفعتوں کا کیا ٹھکانا جس پر خود اس کا آقا اور مولا سلام بھیجے۔ یہی تو وہ ایک کام ہے جس میں عبد کے ساتھ معبود اور مخلوق کے ساتھ خالق بھی برابر کا شریک ہے۔

محمد ﷺ جب غارِ حرا میں داخل ہوئے تو محمد بن عبداللہ تھے، جب نکلے تو محمدؐ رسول اللہ تھے۔ لیکن تفویضِ رسالت سے پہلے بھی، محمد بن عبداللہ کی زندگی کا محور اللہ کی ذات تھی جو منصبِ رسالت پر فائز ہونے کے بعد، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کھاتے پیتے، ان کی رگ رگ، روئیں روئیں اور نفس نفس میں سما چکا تھا۔ **"من تو شدم تو من شدی"** کی اس سے مکمل عملی تفسیر دنیا کبھی پیش نہ کر سکے گی۔ قرآن پڑھیں تو بعض جگہ یوں لگتا ہے جیسے دو دوستوں میں دِل کی باتیں ہو رہی ہیں۔ کہیں محبت کا اظہار ہو رہا ہے، کہیں تسلی دی جا رہی ہے، کہیں تعریف کی جا رہی ہے، کہیں خوش خبری دی جا رہی ہے، کہیں معمولی لغزشوں پر ٹوک کر درگزر کیا جا رہا ہے اور کہیں دوست ﷺ پر سلام بھیجا جا رہا ہے۔ سلام بھیجنے والا کون؟ اور دوست ﷺ بھی کیسا!

محمد ﷺ دیکھنے میں تو گوشت پوست کے ایک انسان لگتے تھے لیکن حقیقت میں اللہ کا ایک جامع پروگرام تھے جو کمپیوٹر کے پروگرام کی طرح ان کے دل، دماغ اور روح میں جذب کر دیا گیا تھا اور انہیں ہر لمحے کنٹرول کرتا تھا کیوں کہ ان کو بھیجنے والے نے اس مبارک ہستی ﷺ کو ایک خاص مقصد کے لیے اس جہانِ فانی میں بھیجا تھا۔ ان ﷺ کا ہر قول اور ہر فعل اللہ کی طرف سے تھا اور انہیں بھی علم تھا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ جب یہ فیصلہ کرنے کا وقت آیا کہ وہ ﷺ مدینے میں کس کے مہمان ہوں گے تو زبان سے نکلا کہ جہاں بھی میری اونٹنی بیٹھ جائے۔ اونٹنی جہاں بیٹھی، وہاں ایک نالے، چند قبروں، کچھ درختوں اور چھوارے بنانے کے چند چبوتروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیکن اونٹنی کے بیٹھنے کے بعد، چودہ سو برس سے، لاکھوں نہیں، کروڑوں نہیں، اربوں کی تعداد میں دُنیا کے ہر کونے سے، ہر عمر، رنگ، زبان، ملک اور قوم کے انسان، ہر قسم کی سواریاں

دوڑاتے، اس مختصر سی جگہ کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھنے کے لیے رواں دواں رہے ہیں اور انسان کی بات محض اس لیے کی جا رہی ہے کہ انسانی آنکھ ابھی انسانوں کو ہی دیکھ سکتی ہے۔ اسی طرح چند برس بعد جب حدیبیہ کے مقام پر فیصلہ کرنا تھا کہ اسلامی لشکر کہاں پڑاؤ ڈالے تو پھر یہی فرمایا کہ جہاں میری اونٹنی بیٹھ جائے۔ اونٹنی جہاں بیٹھی وہاں سواری کے لیے پانی تھا، نہ سواروں کے لیے۔ ساتھیوں کو قدرتی طور پر تشویش ہوئی لیکن اونٹنی سوار ﷺ کے اترتے ہی پانی بھی مل گیا اور وہ معاہدہ بھی ترتیب پایا جسے رب العالمین نے ''فتح مبین'' قرار دیا۔ فیصلہ اونٹنی کر رہی تھی نہ وہ ﷺ۔ فیصلہ تو کوئی اور ہی کر رہا تھا! سچ تو یہ ہے...... ہر چند ہر سچ کی طرح اس سچ میں بھی مشکل بہت ہے...... کہ جب انسان اللہ کا ہو جاتا ہے تو اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔ پھر انسان کے ہاتھ میں اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اللہ کے فیصلے انسان کے فیصلے ہو جاتے ہیں اور انسان کے فیصلے اللہ کے فیصلے بن جاتے ہیں۔

محمد ﷺ کی زندگی اللہ کے کلام کے مطابق اسوۂ حسنہ تھی۔ قرآن کے الفاظ میں آپ ﷺ اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر تھے۔ ان ﷺ کی چہیتی بیوی عائشہؓ کے الفاظ میں قرآن آپ ﷺ کا اخلاق تھا۔ ایک قرآن وہ ہے جسے ہم اور آپ دیکھتے، سنتے اور پڑھتے ہیں۔ ایک قرآن وہ تھا جو مکے کے بازاروں اور مدینے کی گلیوں میں گشت کرتا تھا۔ جو خانہ کعبہ میں ملتزم سے لپٹ کر، بچوں کی طرح، بلک بلک کر روتا تھا۔ جو تپتے بخار کی حالت میں، رات رات بھر، جنت البقیع میں، اپنے امتیوں کی قبروں پر گڑ گڑا، گڑ گڑا کر ان کے لیے دعائے مغفرت کیا کرتا تھا۔ جو معصوم بچوں کو کبھی اپنے سینے سے چمٹاتا، تو کبھی ان کے لیے سواری بن جاتا۔ مبارک ہیں وہ آنکھیں جنہوں نے اسے ﷺ دیکھا۔ مبارک ہیں وہ کان جنہوں نے وہ پیاری آواز سنی۔ مبارک ہیں وہ دل جن کی دھڑکنوں میں وہ ﷺ آج بھی بس رہے ہیں۔ ان ﷺ سے بڑا انسان ان ﷺ سے پہلے پیدا ہوا، نہ ان ﷺ کے بعد پیدا ہوا، اور نہ کبھی ہوگا۔ وہ ﷺ صرف

خاتم النبین ہی نہ تھے، رحمت للعالمین بھی تھے اور یہ الفاظ خود رب العالمین کے ہیں۔

اللہ نے صرف اپنے حبیب ﷺ کا ذکر ہی بلند نہیں کیا، بلکہ جس نے بھی اللہ کے حبیب ﷺ کو اپنا محبوب جانا، اس کا بھی ذکر بلند کیا۔ حبشی بلال کو ویسے بھلا کون جانتا۔ اور موذنِ اسلام بلالؓ کو کون مسلمان ہے جو نہیں جانتا۔ ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ کی شہرت اگر ہوتی بھی، تو صرف اپنے اپنے قبیلے، علاقے یا زمانے تک محدود رہتی۔ لیکن یہ اس یتیم بچے ﷺ کی مقناطیسی قوت اور کیمیا گری کا ہی اثر تھا کہ جو بھی کھنچا چلا آیا، نام پا گیا، اور جو جتنا قریب آتا گیا، اس کے نام کو اس جہاں میں اتنی ہی جلا ملی اور دو جہاں میں اتنا ہی اونچا مقام ملا۔ خطاب کا غصیل بیٹا ننگی تلوار سونتے قتل کرنے آتا ہے لیکن اللہ کا حبیب ﷺ اسے، اپنے اللہ سے، اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے، مانگ چکا ہے۔ تلوار نیام میں چلی جاتی ہے، جب نکلتی ہے تو اسلام کی تلوار بن جاتی ہے، آدھی دنیا پر چھا جاتی ہے اور رہتی دنیا تک یاد رہتی ہے۔ عمر بن خطاب امیر المومنین عمر فاروقؓ بن جاتے ہیں۔ اور قبیلہ بنو عدی کے اس فرد کا نام، صرف اسلام کی نہیں، دُنیا کی تاریخ کے عظیم ترین حکمرانوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ صرف مقناطیسیت ہی نہیں، کیمیا گری ہے۔ عام دھات کو سونا بنانے کا عمل۔ انسان تو انسان، دشوار گزار پہاڑوں کے جن غاروں میں قیام کیا، انہیں بھی نہ صرف شہرتِ لازوال عطا کی بلکہ زیارت گاہِ خاص و عام بنا دیا۔ یہ پہاڑ نہ ہمالیہ کی طرح بلند تھے کہ بلندی کی بناء پر نام پاتے، نہ کوہِ مری یا ایلپس کی طرح خنک اور سرسبز کہ صحت افزا مقام بن کر انسانوں کے کام آتے۔ ان کی اگر کوئی صفت ہے تو صرف اور صرف یہ کہ ایک یتیم بچے ﷺ نے، ایک خاص وقت میں، یہ دور افتادہ غار اپنے قیام کے لیے چنے، اور اسی انتخاب نے کسی بے نام غار کو حِرا، اور کسی بے نور غار کو ثور کا نام دے کر رہتی دُنیا تک ان کا نام کر دیا۔ لوگ تو چودہ برس بعد اپنے باپ دادا کو بھول جاتے ہیں اور یہاں چودہ سو برس گزرنے کے بعد بھی انسانوں اور غاروں کے ناموں کو شہرت ہی نہیں، کھربوں انسانوں کی عقیدت، بلکہ محبت، حاصل رہی

ہے۔ مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اگر یہ معجزہ نہیں تو پھر معجزہ کیا ہوتا ہے؟ اور ہمیں مافوق الفطرت واقعات میں معجزے تلاش کرنے کا خیال ہی کیوں آتا ہے۔

وَرَفَعنَالَکَ ذِکرَکَ کا اس سے بڑا، جیتا جاگتا اور مستند ثبوت بھلا اور کیا ہوسکتا ہے؟ یہ ذکر کل بھی بلند تھا، آج بھی بلند ہے اور کل بھی بلند رہے گا۔ یہ ذکر ازل سے بلند ہے اور ابد تک بلند رہے گا۔ یہ ذکر اس گھڑی تک بلند رہے گا جب تک اللہ کا نام بلند ہے، اور اس وقت تک موجود رہے گا جب تک اللہ موجود ہے، اور اللہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس ذکر کو بلند کرنے کے لیے بلند آواز ضروری نہیں، بلند دعوے درکار نہیں۔ جو بھی سچے دِل اور صحیح عقیدے سے ایک بار خود کو اس سے وابستہ کر دے گا وہ اس کا حصہ بن جائے گا۔ یہ ذکر بلند سے بلند تر ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا کیوں کہ اس کی جبلت میں بلند ہونا ہے، اور اپنے وابستگان کو بھی بلند سے بلند تر کرتا رہے گا کیوں کہ اسے بلند کرنے کا ذمہ اس نے لیا ہے جو کائنات کی ہر شے سے بلند و برتر ہے۔

"وَرَفَعنَالَکَ ذِکرَکَ" "ہم نے تمہارا ذکر بلند کیا۔"

اس تحریر کا آغاز ایک عاشقِ رسول ﷺ کی عشق و عقیدت سے شرابور نثری تحریر سے ہوا تھا۔ مناسب لگتا ہے کہ اس کا اختتام بھی اسی کی عشق و مستی میں ڈوبی ہوئی شعری تحریر سے ہو:

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادئ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یاسین، وہی طاہا

صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

بابِ جنت

روایت ہے کہ خواجہ نظام الدین اولیاء اس دروازے کے باہر کھڑے تھے کہ اچانک ان پہ وجد طاری ہو گیا اور انہوں نے تالیاں بجا کر کہا "رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ جو اس دروازے میں داخل ہوا، امن پا گیا۔" اس کے بعد اس دروازے کے بھاگ جاگ اٹھے۔

بابِ جنت

مَنْ دَخَلَ هٰذَا الْبَابَ اٰمِنَ : جو اس دروازے میں داخل ہوا امن پا گیا۔

۱۱

فریدالدین مسعود گنج شکرؒ

اجودھن کا بڑا بازار ترک، افغان اور ہندوستانی سپاہیوں سے یوں کھچا کھچ بھرا تھا
کہ توشے کی تھالی پھینکیں تو سروں پہ تھرکتی ایک سرے سے دوسرے سرے پر پہنچ جائے۔
سلطنتِ دہلی کا یہ عظیم لشکر، پہاڑی نالے کی تیزی سے، اجودھن کی ایک پہاڑی کی طرف
بڑھ رہا تھا۔ وہ یہ پہاڑی فتح کرنے نہیں بلکہ اس سے مفتوح ہونے کی آرزو لیے دہلی
سے رواں دواں چلا آ رہا تھا۔ لشکریوں کے دل اشتیاق سے بے قرار لیکن زبانیں ادب
سے گنگ تھیں۔ اس خاموشی کو کوئی آواز توڑ رہی تھی تو وہ ان فوجیوں کے ہزاروں قدموں
کے ایک ساتھ زمین سے اٹھنے اور پھر زمین سے لگنے کی دھمک تھی۔

جاں نثار مریدوں نے شوق کا یہ طوفان اپنی جانب امنڈتے دیکھا تو خوشی اور فخر
کے بجائے جو ایک عام انسان ایسے موقع پر محسوس کرتا ہے، سخت تشویش میں مبتلا ہو گئے۔
اچانک کسی کو تدبیر سوجھی۔ مرشد کی پرانی قمیص کی آستین، شہر کے سب سے بڑے بازار
میں، اتنی اونچائی پر ٹانگ دی گئی کہ صرف انگلیوں کی پوریں اسے چھو سکیں۔ اعلان کر دیا
گیا کہ سپاہی اسے چھوتے جائیں اور آگے بڑھتے جائیں۔ لشکر دیوانوں کی طرح جھپٹا۔
پہلے انگلیوں کی پوروں نے پیوند لگی لمبی آستین کو بار بار چوما۔ وفورِ شوق بڑھا تو پوری پوری
انگلیاں اس سے مَس ہونے لگیں، پھر ہتھیلیوں نے اچک اچک کر بلائیں لیں اور پھر
دیکھتے ہی دیکھتے دیوانوں، مستانوں اور پروانوں نے اس کا تار تار نوچ کر تبرّ کاً محفوظ
کر لیا۔ کچھ دیر بعد، آستین کی جگہ وہ رسی لٹکی رہ گئی جس سے آستین ٹانگی گئی تھی۔ سیکڑوں
میل دور سے کشاں کشاں آنے والے ہزاروں بے تاب عاشق بھلا ایک رفو ہوئی، پیوند
لگی آستین کے لمس سے کیا مطمئن ہوتے؟ وہ تو اس انسان کے دیدار کو تڑپ رہے تھے جو
دلوں کے چاک رفو کرتا تھا، جس نے چھری پیش کرنے والے سے کہا تھا ''مجھے چھری
نہیں، سوئی دو کہ میں کاٹتا نہیں، سیتا ہوں۔''

ٹیڑھی میڑھی پتھریلی پگڈنڈیوں سے، سپاہیوں نے پھر پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ تلواریں نیام میں ڈالے، ادب سے سر جھکائے، کلمۂ طیبہ کا وِرد کرتے، نعرۂ تکبیر اور نعرۂ فرید بلند کرتے، لشکر کا ہراول دستہ، پہاڑی کے اوپر بنی، ایک چھوٹی سی، نیچی چھت والی کٹیا کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں وہ مردِ حق شناس، خود آگاہ و خدا بین، اپنے موٹے جھوٹے، ڈھیلے ڈھالے، پیوند لگے، پھٹے پرانے کپڑوں میں، کچی زمین پر ایک مختصر سا کمبل بچھائے، کسی کی دُھن میں مگن، اپنا دِل پسند فارسی مصرع زیرلب گنگنا رہا تھا۔ ع

از بھرِ تُو میرم از برائے تُو زِیم

ترجمہ: ''میں تیرے لیے مرتا تیرے لیے جیتا ہوں۔''

ہزاروں قدموں کی چاپوں سے اُٹھنے والی آواز اب شہد کی کروڑوں مکھیوں کی بھنبھناہٹ میں بدل گئی تھی۔ مریدوں کی جب اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو چاروں طرف گھیرا ڈال کر کھڑے ہوگئے۔ کسی نے بلند آواز میں پکارا ''خبردار! یہ جائے ادب ہے۔ محبت کی بے خودی یا عقیدت کی وارفتگی میں کوئی ایسی گستاخی نہ ہوجائے جس سے شیخ کو کوئی ذہنی یا جسمانی تکلیف پہنچے۔'' یہ آواز جس نے جہاں سنی وہیں تھم گیا اور اپنے پیچھے آنے والوں کو پیغام پہنچا دیا۔ پل بھر میں، یہ بڑھتے، اٹھتے، مچلتے، دوڑتے، بھاگتے قدم اپنی اپنی جگہ جیسے چپک کر رہ گئے۔ مریدوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اچانک ایک کالا کلوٹا، بڈھا کھوسٹ فراش جو نہ جانے کب سے ایک کالے بھونرے کی طرح، موقع کی تاک میں، اِدھر اُدھر منڈلا رہا تھا، سپاہیوں کے ہجوم اور مریدوں کی ٹانگوں کے بیچ میں سے، کینچوے کی طرح بل کھاتا، اپنا میلا کچیلا مریل جسم گھسیٹتا، اس کمبل نشین کی طرف لپکا جس کے بارعب نورانی چہرے کی ایک جھلک دیکھنے کی آرزو، جس کے سخی ہاتھوں کو چھو لینے کی کشش، جس کی مدھم اور میٹھی آواز سننے کی تڑپ اور جس کی دُعا کی قبولیت کی شہرت، ان ترکوں، افغانوں اور ہندوستانیوں کو جو دہلی سے ملتان جا رہے تھے، آج اجودھن لے آئی تھی اور جو اس کے بعد بھی خدا جانے کتنوں کو وہاں لاتی رہی ہے اور لاتی رہے گی۔ اس سے قبل کہ کوئی سمجھ پائے کہ یہ فراش کیا کرنے والا ہے، اس نے زقند مار کر شیخ کا پاؤں

اپنے دونوں مشتاق ہاتھوں میں تھام لیا، پاؤں پہ منہ رکھا اور جونک کی طرح چمٹ گیا۔ شیخ نے گھبرا کر پاؤں کھینچنا چاہا، مرید بھی جھپٹے۔ فراش نے آہستہ سے قدموں سے سر اٹھایا اور شیخ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا ''شیخ ! اللہ کی مخلوق سے پرے بھاگتے ہو! شکر کرو اس کا جس نے تمہیں آج یہ عزت دی ہے۔''

شیخ فرید الدین مسعود سر سے پیر تک لرز گئے۔ دماغ میں اللہ کی آخری کتاب کی وہ آیت گونجی جس میں حکم دیا گیا تھا کہ سائل کو کبھی نہ جھڑکنا۔ نظروں کے سامنے مہرولی کے ایک حجرے کا وہ پچاس ساٹھ برس پرانا منظر گھوم گیا جب وہ قطب الاقطاب کے قدموں سے ایسے ہی چمٹے ہوئے تھے۔ خشیت الٰہی سے لبریز دِل کانپ اُٹھا۔ بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور بہشت کے موٹے موٹے آب دار اور انمول موتی ''صاحبِ بابِ جنت'' کے رخساروں پہ ڈھلک کر نورانی ڈاڑھی کے برف سے سفید بالوں میں جنت کے ہار پروتے گئے۔ جس کی دہلیز پہ شہنشاہوں کو قدم رکھنے کا یارا نہ تھا، اس نے عاجزی سے فراش کو دیکھا، معافی مانگی اور اسے اپنے قدموں سے اٹھا کر اپنے فراخ سینے سے لگالیا۔ ''میں تیرے لیے مرتا اور تیرے لیے جیتا ہوں۔''

حق فرید یا فرید حق فرید بابا فرید

*****

یہ وہ دَور تھا جب دہلی کا سلطان، ناصر الدین محمود تھا۔ سلطان دین دار اور فرید الدین مسعود کی توجہ کا طلب گار تھا۔ اس کا مرحوم باپ سلطان التمش، فرید الدین مسعود کے مرحوم مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا معتقد رہ چکا تھا۔ روایت چلی آرہی ہے جس کی آٹھ سو برس بعد تصدیق نہیں کی جاسکتی کہ قطب صاحب نے وصیت کی تھی کہ میرے جنازے کی نماز وہ پڑھائے جس سے عمر بھر نمازِ عصر کی چار غیر مؤکدہ سنتیں اور کسی نماز کی تکبیر اُولیٰ نہ چھٹی ہوں۔ جب وہ وقت آیا جس کے لیے یہ وصیت کی گئی تھی تو ہر آنکھ جھکی جھکی تھی۔ جب خاصی دیر ہوگئی تو اگلی صف سے ایک شخص سر جھکائے آگے نکلا، یہ سلطانِ ہند التمش تھا۔ زار و قطار روتے ہوئے کہا کہ خدا میرا حال جانتا ہے، مجھے ہرگز

منظور نہ تھا کہ کسی اور کو میرے حال سے آگہی ہو، مگر قطب الاقطاب کی مرضی کے آگے چارہ نہیں، سلطان قطب الدین کا تختِ شاہی شمس الدین التمش کے پاس رہا اور خواجہ قطب الدین کی مسندِ خلافت فرید الدین مسعود کے نصیب میں آئی۔ کسی کی بادشاہی چند ماہ رہی تو کسی کی شاہی صدہا برس سے چلی آ رہی ہے۔

فرید الدین مسعود دہلی میں اپنے مرشد کی مسندِ خلافت پر بیٹھ تو گئے لیکن کچھ ہی عرصے بعد، خلقت کے اِزدحام، امرائے سلطنت کی ریشہ دوانیوں، معاصرین کی چشمک کے اندیشے اور قربِ سلطانی سے بچنے کے لیے، دہلی چھوڑ چھاڑ، پہلے دس بارہ برس ہانسی اور پھر کچھ مدت اپنی جائے پیدائش کوتھے وال میں رہنے کے بعد، دہلی سے سیکڑوں میل دور، اجودھن آ گئے۔ یہاں سانپ اور بچھوؤں کا راج، اور جنگلی درندوں اور ایسے انسانوں کا جو ''جانگلی'' کہلاتے تھے، قرب تھا لیکن قربِ سلطانی کا دھڑ کا نہ تھا۔

برسوں بعد، التمش کا بیٹا ناصر الدین محمود، فرید الدین مسعود کے دیدار کی خواہش دِل میں لیے، دہلی سے، اجودھن کے راستے، ملتان جا رہا تھا۔ وزیرِ اعظم اُلغ خان تک بات پہنچی تو سلطان سے عرض کیا کہ آپ کو تو معلوم ہے کہ بادشاہوں اور بھیڑ بھاڑ سے دور رہنے کے لیے ہی شیخ نے اجودھن میں ڈیرہ ڈالا ہے۔ اور پھر راستہ لمبا ہے، بیچ میں جنگل اور صحرا ہیں، سلطان کی اجازت ہو تو میں سلطان کی طرف سے حاضر ہو جاؤں اور نذرانہ بھی پیش کر دوں۔ حاضری جس کے مقدر میں نہ تھی اس کے لیے وجہیں بنتی چلی گئیں اور وہ محروم رہا۔ جس کے نصیب میں لکھی تھی اس نے وجہ بنا لی اور حاضر ہو گیا۔ دُعا اور راہ نمائی کا طالب ہوا۔ شیخ دھیمی آواز اور شیریں لہجے میں، ایک ایک لفظ، ایسے ٹھہر ٹھہر کر بولتے تھے کہ دل نشیں باتیں دماغ پر بھی نقش ہو جاتی تھیں۔ اُلغ خان ہر بات غور اور ادب سے سنتا رہا۔ مدت سے اور شدت سے آرزو تھی کہ اگر نصیب میں ہے تو دِہلی کا تخت نصیب ہو، لیکن اس حجرے میں آ کر ہمت نہ پاتا تھا کہ دِل کی آرزو زبان پر سوال بنا کر پیش کرے۔ گوش بر آواز رہا کہ شاید، پوچھے بِنا، اس زبانِ معجز بیاں سے کوئی ایسا لفظ نکل جائے جس میں آرزو پوری ہونے کا اشارہ مل جائے۔ وہ بیٹھے بولتے رہے، یہ کھڑا سنتا

رہا۔ ننگے پاؤں، ننگے سر، ہاتھ باندھے اور نظریں ادب سے جھکائے۔ اور پھر فارسی کے یہ دو شعر، قدرت کی کسی حسین اور مترنم سرگوشی کی طرح، کوثر و تسنیم میں دُھلی، میٹھی، مدھر اور مدھم آواز میں، اُلغ خان کے منتظر اور مشتاق کانوں تک پہنچے ۔

فریدونِ فرخّ، فرشتہ نہ بود
زِعُود و زِعنبر سرشتہ نہ بود
زِ داد و دہش یافت آں نیکوئی
تو داد و دہش کُن فریدوں توئی

ترجمہ: ''خوش بخت فریدوں کوئی فرشتہ نہ تھا اور نہ ہی اس کا خمیر عُود اور عنبر سے اٹھا تھا۔ اس نے سخاوت سے بزرگی پائی، تو بھی سخاوت سے فریدوں بن سکتا ہے۔''

حدیثِ قُدسی ہے کہ ''بندہ عبادت کے ذریعے مجھ سے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اسے دوست بنالیتا ہوں اور جب میں اسے دوست بنالیتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔'' اسی بات کو مولانا جلال الدین رومی نے اپنی مثنوی میں، کہ ''قرآں در زبانِ پہلوی'' کہلاتی ہے، یوں کہا ہے اور اپنی ہر کہی، بلکہ کہلوائی ہوئی، بات کی طرح کیا خوب کہا ہے کہ ۔

گفتۂ اُو گفتۂ اللہ بَود
گرچہ از حلقومِ عبداللہ بَود

ترجمہ: ''اس کا کہا اللہ کا کہا ہے، اگرچہ وہ اللہ کے بندے کی زبان سے ادا ہو رہا ہوتا ہے۔''

یہاں بھی اشعار تو فرید الدین مسعود کی زبان سے ادا ہو رہے تھے لیکن فیصلہ اللہ اپنا سنا رہا تھا۔ اجودھن کی جھونپڑی میں دہلی کا تخت عطا ہو رہا تھا۔ ہندوستان کا بے تاج

بادشاہ، اپنے جھونپڑے میں، کچی زمین پر، اپنے چھوٹے سے پرانے پیوند لگے کمبل پہ بیٹھا جو دن کو اس کی دری اور رات کو اس کی توشک کا کام بھی دیتا تھا، اُلغ خان کو غیاث الدین بلبن بنا کر ہندوستان کے بدصورت اور خوش بخت وزیر اعظم کے جھکے ہوئے سر پر دہلی کی سلطنت کا تاج رکھ رہا تھا۔ امیدوار کا غنچۂ امید کھل اٹھا۔ اجازت چاہی۔ ننگے سر آیا تھا اور بہ ظاہر ننگے سر ہی اُلٹے پاؤں لوٹا۔ نصیب کا در کھل گیا تھا۔ ادب سے سلام بجا لایا اور جھونپڑی کا دروازہ بند کیا۔ فرید الدین مسعود نے مسکرا کے دیکھا اور دوبارہ کسی کی دُھن میں کھو گئے۔ آنے والا تھا ہی کون جو اس کے بارے میں اور سوچتے؟ دی جانے والی چیز تھی ہی کیا جو اس کا مول پوچھتے؟ ہندوستان کی اصل بادشاہت تو کب سے کسی اور کے مقدر میں لکھی ہوئی تھی، اور وہ بعد میں، اسی حجرے میں، دہلی سے آئے ہوئے ایک خوش شکل نوجوان کو ان الفاظ میں عطا ہونی تھی:

"مولانا نظام الدین! دین اور دُنیا میں سے جو کچھ یہاں ہے، وہ تمہیں عطا کر دیا گیا۔ اب دہلی جاؤ اور ہندوستان پر راج کرو۔"

حق فرید یا فرید　　　حق فرید بابا فرید

✵✵✵✵✵

فرید الدین مسعود کے بچپن کے بارے میں بعض محیر العقل کہانیاں اکثر کتابوں میں درج ہیں جن کا تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے۔ ہم اگر ان مافوق الفطرت روایتوں کو، تاریخی ثبوت نہ ہونے کی بنا پر، مان نہیں سکتے تو صرف اس وجہ سے رَد بھی نہیں کر سکتے کہ وہ آج ہمارے نزدیک محیر العقل یا مافوق الفطرت ہیں۔ آنے والا کل کس نے دیکھا ہے؟ وہ چیزیں جو کل ناممکن لگتی تھیں آج نہ صرف ممکن بن چکی ہیں بلکہ عام آدمی کو اس کی روزمرہ زندگی میں نظر آتی ہیں۔ جو آج سمجھ میں نہیں آتیں وہ کل سمجھ میں آ سکتی ہیں۔ وہ بچپن میں یتیم ہو گئے جیسے ان کے مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، یا ان کے عظیم ترین مرید اور خلیفہ خواجہ نظام الدین اولیاء بچپن میں یتیم ہو گئے تھے، یا ان سب پیروں کا پیر ﷺ اور دنیا کا سب سے بڑا انسان ﷺ ابھی ماں کے پیٹ میں تھا کہ یتیم کر دیا گیا تھا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا کے اکثر بڑے انسان بچپن میں یتیم ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ محض اتفاق ہے؟ اگر ہے تو ایسے اتفاقات کا اتنے لوگوں کے ساتھ اور ایسے تواتر سے ہوتے رہنا یقیناً ایک پُر اَسرار اتفاق ہے۔ وہ جو ہمیں عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ جو ہماری پرورش کرتا اور کراتا ہے۔ جو ماں کے دِل میں ممتا اور باپ کے دِل میں محبت پدری ڈال کر ہمیں ہمارے ماں باپ سے ستّر گنا زیادہ چاہتا ہے، اس کے لیے بھلا کیا مشکل تھا کہ جن کے لیے لکھ دیا گیا تھا کہ وہ بڑے ہو کر بہت بڑے ہوں گے، یا مرنے کے بعد بھی کبھی نہ مریں گے، انہیں بچپن میں یتیم نہ ہونے دیتا۔ اس کے لیے تو کچھ، بلکہ سب کچھ، کرنے کے لیے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ”ہو جا“ اور وہ ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ صرف صاحبِ کن فیکون ہی نہیں، مسبّب الاسباب بھی ہے۔ اگر اس کی مشیت ہوتی تو دنیا کا ہر کام بے شک بلا سبب ہی ہوتا رہتا۔ لیکن اس کے کام کرنے کا ایک انداز ہے۔ وہ ہر کام کے لیے پہلے سبب یا اسباب بہم پہنچاتا ہے اور پھر اپنے فیصلے نافذ کرتا اور کراتا ہے۔ بعض کج فہم یا کم فہم ان اسباب کو ہی سب کچھ جان کر مسبّب الاسباب کو بھول جاتے ہیں، لیکن اس کی شان کے قربان کہ وہ اپنے بھولنے والوں کو پھر بھی نہیں بھولتا۔ اسی طرح بعض اوقات اس کے بعض فیصلے سمجھ میں نہیں آپاتے، لیکن اگر اس بے کراں کائنات کو پیدا کرنے والے اور اس کا نظام چلانے والے کا ہر فیصلہ، ہر وقت، ہر انسان کی سمجھ میں آنا لازمی قرار پاتا اور جب تک ہر کس و ناکس کی سمجھ میں نہ آپاتا اس وقت تک نافذ نہ ہو پاتا تو پھر اس کائنات کا نظام کیسے چلتا؟ اور علیم اور لاعلم اور خبیر اور بے خبر کے درمیان فرق کیا رہ جاتا؟ اس کے ہر ارادے کے پیچھے کوئی مصلحت اور ہر مصلحت میں کوئی بہتری ہوتی ہے۔ اس کے بہت سے فیصلوں میں کوئی سِرِّ نہاں ہوتا ہے۔ یہ اَسرار کبھی، اس کی رضا سے، کسی دانائے راز پہ آشکار کیے جاتے ہیں، تو کبھی اس کی عطا سے، کسی عامی کو بھی محرمِ راز بنا لیا جاتا ہے۔ اس کی رضا کے حصول کے لیے، کبھی عمر بھر کے سجدے ناکافی ہوتے ہیں، تو کبھی اس کے فضل سے محض ایک اشکِ ندامت سے بہت کچھ دُھل جاتا اور سب کچھ مل جاتا ہے، اس کے فضل کی کوئی حد ہے نہ حساب۔ یہ کس پہ ہوتا ہے؟ کیوں ہوتا

ہے؟ کب ہوتا ہے؟ کتنا ہوتا ہے؟ کیسے ہوتا ہے؟ کیسے بتایا جاتا ہے؟ کیسے سمجھایا جاتا ہے؟ یہ خود ایک راز ہے اور سینۂ کائنات کے ہر سربستہ راز کی طرح کبھی کسی دانائے راز پہ آشکار ہوتا ہے تو کبھی کسی عاصی یا عامی پر بھی کھول دیا جاتا ہے۔

ذکر تھا فرید الدین مسعود کے یتیم ہونے کا۔ کسی مصلحت کے تحت وہ بچپن میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ بیٹی بیٹوں کی تعلیم، تربیت اور پرورش کا پورا بوجھ چونکہ بیوہ ماں کے کندھوں پہ ڈالنا تھا اس لیے قرسُم بی بی کو اتنی فہم، بصیرت، بزرگی اور اتنا حوصلہ عطا کیا گیا کہ وہ باپ بھی بن سکیں۔ ان کے منجھلے بیٹے سے قدرت کو بہت بڑا کام لینا تھا چنانچہ وہ تمام داخلی اور خارجی اسباب، مسبّب الاسباب کی طرف سے، مناسب وقت آنے پر، پیدا کیے جاتے رہے جن سے قرسُم بی بی خود بھی اس کام کے لیے تیار ہو سکیں اور اپنے منجھلے بچے کو بھی تیار کر سکیں۔

اس یتیم بچے کو، بچپن سے ہی اپنے پیدا اور پرورش کرنے والے کی یاد میں ایسا مستغرق کیا گیا کہ وہ اپنی جائے پیدائش کوتھے وال میں ''قاضی بچہ دیوانہ'' کہلانے لگا، یعنی قاضی کا بچہ جو دیوانہ ہو گیا ہے۔ اور جب یہ استغراق اس مقام پہ پہنچا جہاں مسعود کو اس وقت پہنچانا مقصود تھا تو نامور صوفی شیخ جلال الدین تبریزی کو حکم ہوا کہ کوتھے وال پہنچو۔ وہ بغداد سے نکلے تو تھے دہلی کا قصد کر کے لیکن روانہ ملتان کے رستے ہوئے۔ کوتھے وال پہنچے تو پوچھا کہ لوگو! تمہارے اس قصبے میں کوئی صوفی بھی بستا ہے؟ جواب ملا کہ صوفی تو کوئی نہیں البتہ قصبے کے مرحوم قاضی کا ایک دیوانہ بیٹا ضرور رہتا ہے جو ''قاضی بچہ دیوانہ'' کہلاتا ہے اور قصبے کی مسجد کے پیچھے ہر وقت کسی دُھن میں مگن بیٹھا رہتا ہے۔ شیخ اُدھر ہو لیے۔ راستے میں کسی نے انار تحفۃً پیش کیا۔ مسجد کے پیچھے پہنچے تو ''قاضی بچہ دیوانہ'' کو اس حال میں پایا کہ شلوار جگہ جگہ سے پھٹی تھی اور لو اللہ سے لگی تھی۔ ہوا چلتی تو شرم کے مارے کبھی ایک سوراخ چھپاتے تو کبھی دوسرا۔ آنے والے کو اپنا گیا وقت یاد آ گیا۔ کہا ''مسعود! شکر بجا لاؤ کہ تمہیں شلوار تو نصیب ہے۔ بخارا میں ایک درویش طالبِ علم تو سات برس اس حال میں زیر تعلیم رہا کہ شلوار نصیب نہ ہوئی اور ایک لنگوٹی

پہ گزارہ رہا۔ منتظر رہو کہ کچھ ہونے والا ہے۔" یہ کہہ کر انار کا تحفہ پیش کیا اور کہا کہ کھاؤ۔
"قاضی بچہ دیوانہ" آج بھی حسبِ معمول روزے سے تھا۔ ادب سے معذرت کر لی۔
شیخ نے انار کھایا اور پھر اپنی راہ ہو لیے۔ قاضی بچہ دیوانہ اپنے کام پہ لگ گیا۔ اٹھتے وقت
دیکھا کہ انار کا ایک دانہ "اتفاق" سے زمین پہ پڑا رہ گیا ہے۔ اٹھایا، رومال میں باندھا اور
شام کو اسی سے روزہ افطار کیا۔

جدید سائنس بتاتی ہے کہ جب ذرے کا جگر چیر کر اس کے قلب میں گردش کرنے
والے حقیر ترین ذروں کو ایک دوسرے سے ٹکرایا جائے تو ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کے
دھماکے واقع ہوتے ہیں۔ انار کے اس ایک دانے نے "قاضی بچہ دیوانہ" پہ وہی اثر کیا۔
جیسے سینہ کھول دیا گیا ہو...... اب سے کئی برس پہلے، ایک قلندر کے منہ میں چبائی ہوئی کوئی
چیز منہ میں رکھتے ہی، ان کے دادا پیر خواجہ معین الدین چشتی پر بھی یہی کیفیت طاری ہوئی
تھی۔ آج "قاضی بچہ دیوانہ" کی باری تھی۔ عرصے تک قلق رہا کہ پورا انار کیوں نہ کھالیا۔
جب اپنی محرومی کا ذکر بعد میں اپنے مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے کیا، تو جواب
ملا "بابا فرید! ہر انار میں ایک ہی دانہ کام کا ہوتا ہے۔" انار کا ایک دانہ زمین پر یوں ہی تو
پڑا نہیں رہ جاتا اور اس پر یوں ہی تو نظر نہیں ڈلوا دی جاتی۔ بے شک اس کے کام کرنے
کا اپنا ہی ایک انداز ہے۔

"قاضی بچہ دیوانہ" کو پیدا کرنے والا، اس کی پرورش کرنے والا، اس کو ماں باپ
سے ستّر گنا زیادہ چاہنے والا اب اپنے بندے پر اپنی رحمت کے وہ باب کھولنے والا تھا
جہاں سے ہر راہ سیدھی دائرۂ محمدی ﷺ میں داخل ہوتی ہے۔ انار کے ایک گرے پڑے
دانے کا روحانی تجلیات کا کیپسول (Capsule) بن جانا تو مسبّب الاسباب کی طرف
سے محض ایک بہانہ تھا۔ حق تو یہ ہے کہ حق کی طرف سے حق دار کو راہِ حق میں اس کا حق
دلانے کی گھڑی آن پہنچی تھی، اور جب وہ گھڑی آ پہنچے، تو ہے کسی کی مجال کہ اس میں پل
بھر کی دیر، یا بال برابر کا فرق ڈال سکے۔

شیخ جلال الدین تبریزی کو ملتان بھجوانے کے بعد، مسعود کو حکم ہوا کہ اب تم بھی

کوتھے وال سے نکلو اور ملتان پہنچو جہاں تقدیر تمہاری منتظر ہے۔ اٹھارہ سالہ فرید الدین مسعود ملتان پہنچے اور ایک دینی مدرسے میں داخلہ لیا، قرآن حفظ کیا اور پھر دینی علوم حاصل کرنے میں مشغول ہو گئے۔ مدرسہ ایک مسجد میں تھا۔ ملتان کے تاریخی قلعے کے دامن میں، آدھے میل کے فاصلے پر ''دولت گیٹ النگ'' نامی محلے میں ''جامع مسجد درس والی'' کے نام سے ایک مسجد ہے جس کے دروازے کی لوح پر اس کا سالِ تعمیر ۹۳ ہجری رقم ہے، یعنی یہ مسجد، محمد بن قاسم کے زمانے میں، پہلی دفعہ سوا تیرہ سو برس پہلے تعمیر ہوئی تھی۔ ایک دن مسجد میں بیٹھے اسلامی تعلیمات پر ایک کتاب ''نافع'' پڑھ رہے تھے کہ ایک نو وارد کو نماز میں مشغول دیکھا۔ دل میں اچانک کشش محسوس ہوئی۔ پاس جا کر بیٹھ گئے۔ وہ نماز پڑھتے رہے اور یہ کتاب۔ نو وارد فارغ ہوئے تو پاس بیٹھے نوجوان سے پوچھا ''مولانا! کیا پڑھے جا رہے ہیں؟'' جواب دیا ''نافع''۔ فرمایا ''مولانا! خدا آپ کو اس سے نفع دے۔'' کوتھے وال میں زمین پر پڑے ہوئے دانے نے جس سیمابی کیفیت سے دوچار کیا تھا، ملتان میں کہے گئے اس دعائیہ جملے نے اسے دوچند کر دیا۔ آج پھر مسبّب الاسباب سبب بہم پہنچا رہا تھا، پردے اٹھائے جا رہے تھے، سینہ کھولا جا رہا تھا، راز بتائے جا رہے تھے، قدموں میں گر گئے اور زار و قطار روتے ہوئے کہا ''نفع اس کتاب میں کہاں؟ وہ ملے گا تو ان قدموں میں۔'' یہ بات ۱۱۹۴ء کے لگ بھگ ہوئی، آٹھ صدیاں بیت چکی ہیں۔

تین ہزار دو سو برس پہلے، جب مصر میں پیدا ہونے والے ایک نوجوان اسرائیلی کو جس کی زبان میں لکنت تھی، منتخب کیا گیا اور پھر پیغام پہنچانے کا حکم دیا گیا تو اس نے التجا کی تھی: ''میرے پرورش کرنے والے! میرا سینہ کھول دے۔'' سوا چودہ سو برس پہلے، جب مکے کے ایک اُمّی ﷺ کو منتخب کیا گیا اور زندگی کا آخری پیغام پہنچانے کا فریضہ سونپا گیا تو اسے ﷺ خود جتایا گیا کہ اے ہمارے بندے ﷺ! کیا ہم نے تمہارا سینہ نہیں کھول دیا ہے؟ سو معلوم ہوا کہ پہلے انتخاب ہوتا ہے اور پھر منتخب بندوں کے سینے کھولے جاتے ہیں۔ سینے کھولنے کا ایک وقت ہوتا ہے، دَرجات ہوتے ہیں اور مراحل بھی، لیکن

ہیں اپنا بنانا ہوتا ہے ان کے سینے کھولے ضرور جاتے ہیں۔
خواجہ قطب الدین بختیار کا کی سے ملنے کے بعد، فرید الدین مسعود یہ مدارجِ،
علہ وار، طے کرتے رہے۔ ان کی مسلسل عبادت اور پیہم ریاضت کے بارے میں بہت
حکایتیں زباں زدِ عام اور بہت سی روایتیں کتابوں میں درج ہیں جن کے بارے میں
وع میں ایک عمومی تبصرہ کیا جاچکا ہے۔ ان کی مشہورِ زمانہ ریاضتوں کی بعض یادگاریں
تک موجود بتائی جاتی ہیں۔ مثلاً اجمیر میں، خواجہ معین الدین چشتی کے روضے کے وسیع
طے میں، ایک زیرِ زمین حجرہ، پاک پتن کے ''بابِ جنت'' کی طرح سارا سال مقفل
جاتا ہے اور محرم کی پانچویں کو کھولا جاتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں لوگ، جن میں ہندو، سکھ،
لمان سبھی شامل ہوتے ہیں، سیڑھیاں اُتر کر اس کی زیارت کرتے ہیں۔ اسی طرح کی
اور روایت ضلع بہاولپور کے شہر اُوچ کی ایک قدیم مسجد کے پاس ایک پرانے کنویں
بارے میں ہے کہ آپ نے چالیس راتیں، اس میں اُلٹے لٹک کر چلہ کھینچا تھا۔ یہ
بد مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے روضے کے پاس ہے اور ''مسجد حاجات'' کہلاتی تھی۔
بد کے بیرونی دروازے سے صرف چند گز پرے، ایک ستر اسّی فٹ گہرا پرانا کنواں بھی
تک موجود ہے۔ مسجد اور کنویں کی تعمیر میں استعمال ہونے والی پتلی پتلی سرخ اینٹیں
ڑوں برس پرانی ہیں۔ یہی روایت چاولی مشائخ ضلع وہاڑی میں واقع ایک اور کنویں
بھی منسوب ہے۔ (ضعیف) روایتیں اپنی جگہ لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ ریاضت
مجاہدے کے میدان میں، اس برصغیر میں، فرید الدین مسعود کا اپنا ہی مقام ہے۔

کوتھے وال کی مسجد کے پیچھے اس نوجوان سے جو کام شروع کرایا گیا تھا، اس کی
ڑیاں اب سلسلہ چشت سے ملا دی گئی تھیں، اور اسے خواجہ قطب الدین بختیار کا کی کی
رانی میں دہلی میں پروان چڑھایا جا رہا تھا۔ بارھویں صدی عیسوی کے آخری عشرے
، خواجہ قطب الدین بختیار کا کی کے پیر خواجہ معین الدین چشتی دہلی آئے اور اپنے
رید کے پاس ٹھہرے۔ بڑے خواجہ کے آنے کی خبر پاتے ہی پوری دہلی خواجہ قطب
دین بختیار کا کی کے آستانے پر ٹوٹ پڑی۔ کنواں خود چل کر پیاسوں کے پاس آجائے

تو یہی ہوا کرتا ہے۔ جو بھی آتا کچھ لے کر ہی جاتا۔ جب قطب صاحب اپنے تمام مریدوں کو خواجہ بزرگ کی خدمت میں پیش کر چکے تو مرشد نے پوچھا کہ کوئی مرید رہ تو نہیں گیا؟ عرض کیا کہ صرف بابا فرید رہ گئے ہیں کیونکہ وہ اپنے حجرے میں چلے میں بیٹھے ہیں۔ فرمایا ہم خود وہاں چلے چلتے ہیں۔ اللہ اکبر! فرید الدین مسعود کا مقدر خود چل کر ان کے پاس آ رہا تھا۔ دنیائے تصوف کے یہ مہر و ماہ، مہرولی کے اس حجرے میں پہنچے جہاں درویشی کی یہ شمع اللہ کی یاد میں جل رہی تھی۔ مرشد اور ان کے مرشد کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو تعظیم کے لیے اُٹھنا چاہا لیکن شدید جسمانی نقاہت کی وجہ سے پوری طرح اٹھنے نہ پائے تھے کہ زمین پر گر پڑے۔ زمین پر پڑے پڑے سر اُٹھا کر پُرنم آنکھوں سے مرشد کو دیکھا اور خاموشی اور بے چارگی سے سر پھر زمین پہ رکھ دیا۔ نائبِ رسول ﷺ فی الہند نے قطب صاحب سے کہا "بختیار! اس غریب کو اور کب تک گھلاتے رہو گے؟ جو دینا ہے دے دلا کر شاد کام کرو۔" قطب صاحب نے کہا "حضور! بھلا آپ کے ہوتے ہوئے بندہ یہ گستاخی کیسے کر سکتا ہے؟" خواجہ غریب نواز نے فرمایا "بختیار! اس کا تعلق مجھ سے نہیں، تم سے ہے۔ جو بھی ملے گا تم سے ملے گا۔ اب عطا کرو۔" جب قطب صاحب ادب کی وجہ سے پھر بھی ہچکچائے تو سلطان الہند نے فرمایا "اچھا اللہ کی یہی رضا ہے تو ہم دونوں مل کر عطا کرتے ہیں۔" یہ کہا اور فرید الدین مسعود کا دایاں بازو خواجہ معین الدین چشتی اور بایاں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے تھاما اور کھڑا کر دیا۔ فرید الدین مسعود کی پوری نوے سالہ زندگی میں فخر، مسرت، کیف اور برکت کا اس جیسا بھرپور لمحہ پہلے کبھی آیا تھا، نہ عمر کے باقی ستر برسوں میں آیا۔ دائیں طرف نائبِ رسول ﷺ فی الہند، خواجہ غریب نواز، سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی، بائیں طرف قطب الاقطاب، محبوبِ اُویسِ قرنی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، اور بیچ میں بھوک سے نڈھال، پیاس سے بے حال، نیند سے محروم، ہڈیوں کا ڈھانچہ، بیس سالہ نوجوان فرید الدین مسعود۔ داہنی طرف دیکھتے تو غریب نواز، نواز رہے ہوتے، بائیں طرف دیکھتے تو قطب الاقطاب توجہ فرما رہے ہوتے۔ اوپر دیکھتے تو آسمان سے زمین تک انوار کی موسلا دھار بارش ہو رہی

تھی۔ ایسے لمحے بھلا کب کب آتے ہیں اور بھلا کس کس کو ملتے ہیں؟ آج دائرۂ محمدی ﷺ میں پیشی ہو رہی تھی۔ نورِ محمدی ﷺ جلوہ آرا تھا۔ رحمتِ محمدی ﷺ کا اتھاہ سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس کے کنارے پر عرفانِ الٰہی کی منزل تھی اور اس سے آگے اللہ جل شانہ، کی معرفت کا نزول ہو رہا تھا۔ ہر شے تاباں تھی، نازاں تھی، فرحاں تھی، رقصاں تھی، گنگنا رہی تھی، مسکرا رہی تھی۔ سجانے والے نے آج محفلِ لامکاں اور بزمِ لاہوت اس سج دھج اور بانکپن سے سجائی تھی جو کبھی کبھی ہی کسی کسی کے لیے سجائی جاتی ہے۔ میرِ مجلس وہ تھا جس کے سوا کسی پہ میری نہیں سجتی، اور شمع محفل ﷺ وہ تھا جس کے بغیر مکہ سُونا اور مدینہ اُداس ہو جاتا ہے یہ مستند بات ہے کہ سلسلۂ صوفیاء کی صدیوں پرانی تاریخ میں اس جیسی ایک مثال نہیں جہاں اس پایے کے مرشد اور اس مرشد کے مرشد نے بیک وقت اس پایے کے کسی مرید پر اس طرح توجہ کی ہو، جب پیر اور دادا پیر کی توجہ مکمل ہو چکی اور فرید الدین مسعود ایسے فیض یاب ہو چکے جیسے فیض یاب ہوا جاتا ہے تو سلطان الہند نے فرید الدین مسعود کا ہاتھ تھام کر کہا ''پروردگار! ہمارے فرید کو قبول فرما۔'' افلاک سے ندا آئی ''قبول کیا، یہ وحیدِ عصر ہوگا۔''

غیب سے اشارے بھی آتے ہیں، نشانیاں بھی اترتی ہیں، سرگوشیاں بھی سنائی دیتی ہیں اور ندائیں بھی آتی ہیں۔ غیب کی ندا جب آتی ہے تو کسی ایک سمت سے نہیں آتی۔ لگتا ہے کہ اوپر نیچے، دائیں بائیں، آگے پیچھے، ہر طرف سے جیسے گھنٹی کی ایک آواز ہے جو مسلسل چلی آ رہی ہے، جسے اقبالؔ نے بانگِ درا کہا ہے۔ یہ بہت دور سے بھی آتی معلوم ہوتی ہے اور بہت پاس سے بھی۔ یہ مکاں سے بھی ماورا ہوتی ہے اور زماں سے بھی، لیکن یہ اشارے، سرگوشیاں اور ندائیں ہر کس و ناکس کے لیے نہیں ہوتیں۔ ان ہمہ جہتی نداؤں کو وہی سن اور سمجھ سکتے ہیں جنہیں ان کے لیے منتخب کیا جاتا ہے، جن کے کان اور سینے ان کے لیے کھول دیئے جاتے ہیں۔ طُویٰ کے سرد میدان میں، تین ہزار دو سو برس پہلے، جو ندا آئی وہ بھی اس سننے والے نے ہی سنی جو اس کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ مہرولی کی سرزمین پر آٹھ سو برس پہلے جو ندا آئی وہ بھی ان سننے والوں نے ہی سنی جنہیں اس کے

سننے کے لیے خدا جانے کب سے منتخب کیا جا چکا تھا۔

سلطان الہند مولا کا شکر بجالائے۔قطب الاقطاب نے مولا کا شکر اور مرشد کا شکریہ ادا کیا اور اس برات کے نوجوان دولہا کو حکم دیا کہ خواجہ، بزرگ کے قدم لیں۔فرید الدین مسعود کے قلب میں نور کے چشمے پہلے ہی پھوٹ چکے تھے، اب آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے بہہ نکلے۔لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھے اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے قدموں سے ایسے دیوانہ وار لپٹے، ایسے مستانہ وار چمٹے جیسے قرنوں بعد اجودھن میں ایک فراّش کو ان کے قدموں سے چمٹنا تھا۔قطب الاقطاب پریشان سے ہو گئے جس طرح قرنوں بعد فرید الدین مسعود کو پریشان ہونا تھا۔حکم دہرایا۔فرید الدین مسعود پھر بے چارگی سے لڑکھڑاتے ہوئے اٹھے اور اس بار زیادہ والہانہ انداز میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے قدموں میں جا گرے اور سسکیاں لیتے ہوئے کہا ''آقا! خدا کے لیے معاف کر دیں۔کیا کروں ان قدموں کے سوا کوئی اور قدم نظر نہیں آ رہا۔'' قطب صاحب نے گھبرا کے مرشد کو دیکھا۔دانائے راز کے چہرے پر عارفانہ مسکراہٹ تھی۔فرید الدین مسعود پہ نظر ڈالی جو قطب صاحب کے قدموں سے چمٹے ہوئے بے حال اور بے خود تھے۔قطب صاحب کو دیکھا جو عالمِ حیرانی میں کھڑے تھے، فرمایا ''بختیار! یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔اس منزل پہ پہنچ گیا ہے جہاں صرف وحدت ہوتی ہے، دوئی کا نام نہیں رہتا، پھر اسے تمہارے سوا کوئی اور کیسے نظر آ سکتا ہے؟'' اور پھر نائبِ رسول ﷺ فی الہند کی زبان سے وہ الفاظ نکلے جو آج تک آسمانِ صداقت پر سورج چاند اور ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں اور ہمیشہ یوں ہی جگمگاتے رہیں گے۔فرمایا ''بختیار! تم ایک ایسے شہ باز کو دام میں لائے ہو جو سدرة المنتھیٰ سے وَرے ٹھکانا نہ کرے گا۔فرید ایک شمع ہے جس سے درویشی کا سلسلہ سدا روشن رہے گا۔''

حق فرید یا فرید   حق فرید بابا فرید

* * * * *

ازمنہ وسطیٰ کے اکثر اولیا اللہ کی طرح، فرید الدین مسعود کے بارے میں وقت گزرنے اور عقیدت بڑھنے کے ساتھ بعض ایسی باتیں بھی مشہور ہوتی گئیں جن کے مستند تاریخی ثبوت آج موجود نہیں۔ ایسی پانچ مشہور باتوں کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے۔ سب سے پہلے چند الفاظ ''گنج شکر'' کے لقب کے بارے میں جو فرید الدین مسعود کے نام کا ایسا حصہ بن چکا ہے کہ اکثر لوگ انہیں اگر بابا فرید کے نام سے جانتے ہیں تو بعض گنج شکر کے لقب کے بغیر نہیں پہچان سکتے۔ مختلف کتابوں میں اس معروف لقب کے بارے میں کم از کم چار مشہور حکایتیں درج ہیں۔ اس تحریر کا مقصد ان کے بارے میں صدیوں سے مشہور مختلف حکایتوں اور روایتوں کو بلا تحقیق دہرانا نہیں جن کے لیے کوئی کتاب بھی پڑھی جاسکتی ہے، بلکہ بعض ایسے حقائق سے پردہ اٹھانا ہے جن کی بہتوں کو پوری طرح خبر نہیں۔ ویسے بھی آٹھ سو برس بعد، اور ٹھوس تاریخی شواہد کی عدم موجودگی میں، یہ فیصلہ کرنا کہ ان میں سے کون سی روایت درست ہے اور کس حد تک صحیح ہے، ممکن نہیں، جس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ یہ ساری روایتیں من گھڑت ہیں۔ گنج شکر کی روایت کے بارے میں بتانے والی پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کے سب سے چہیتے مرید اور خلیفہ خواجہ نظام الدین اولیا کے مستند ملفوظات میں، جو فرید الدین مسعود کے ذِکر مسعود سے ایسے جگمگا رہے ہیں جیسے صاف وشفاف آسمان پر روشن تارے، ان کے نام کے ساتھ ایک بار بھی گنج شکر نہیں لکھا گیا اور نہ اس روایت کے بارے میں کچھ ذکر کیا گیا ہے۔ خواجہ نظام الدین اولیاء کے مستند ملفوظات میں انہیں زیادہ تر شیخ الاسلام یا پھر شیخ کبیر کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی انہیں ''بابا'' کہتے تھے۔ فرید الدین مسعود خود اپنے آپ کو صرف مسعود کہتے تھے جو غالباً آپ کا پیدائشی نام تھا۔ دوسری بتانے والی بات یہ ہے کہ اللہ والوں کے یہ شہرۂ آفاق القاب اس وقت تک نہ یوں زبان زدِ عام ہوتے ہیں نہ ایسی بقائے دوام پاتے ہیں جب تک ان میں اللہ کی رضا شامل نہ ہو۔ گنج شکر کے لقب کی اصل وجہ اور صحیح بنیاد یہی ہے جس کا ظاہر ہے کہ کوئی ظاہری سبب مسبّب الاسباب نے ضرور پیدا کیا ہوگا۔

دوسری مشہور روایت ان کے مزار کے پائنتی کے دروازے کے بارے میں ہے جس کی بنا پر عام دروازوں کی طرح نظر آنے والا یہ دروازہ صدیوں سے ''بابِ جنت'' یا جنتی دروازہ کہلاتا ہے۔ اس روایت پر لوگوں کا اتنا پختہ عقیدہ صدیوں سے چلا آرہا ہے کہ پاک پتن میں آپ کے سالانہ عرس کے موقع پر، جب یہ دروازہ، سال میں پہلی بار، پانچ محرم کو نمازِ عشاء کے بعد کھولا جاتا ہے اور پانچویں سے نویں محرم تک، پانچ راتیں، عشاء سے فجر تک کھلا رکھا جاتا ہے تو لاکھوں بچے، جوان اور بوڑھے (بچیوں اور عورتوں کا داخلہ مزار میں ممنوع ہے۔) اس میں سے محض چند لمحوں کے لیے گزرنے کی سعادت حاصل کرنے کی آرزو میں، گھنٹوں اور پہروں، لمبی لمبی قطاریں لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہاں بھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ ٹھوس تاریخی ثبوت کی عدم موجودگی میں، سات سو برس بعد یہ قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ خلقِ خدا کی زبان پہ چڑھی اور دِل و دماغ میں بیٹھی ہوئی یہ روایت جس انداز میں پیش کی جاتی رہی ہے وہ کس حد تک درست ہے؟ جس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ اس کا وقوع ناممکن تھا، یا ہے۔ اس مسئلے پر آگے چل کر تفصیلی بات ہوگی۔

تیسری مشہور بات ان کے شاہی شجرۂ نسب اور شاہی ازدواجی رشتے کے بارے میں ہے۔ اکثر کتابوں میں درج ہے کہ ان کا تعلق افغانستان کے شاہی خاندان سے تھا۔ اس بات کو بھی اگر ہم مستند تاریخی ثبوت کی عدم موجودگی کی بنا پر صحیح نہیں مان سکتے تو صرف اس وجہ سے غلط بھی قرار نہیں دے سکتے کہ ہمیں جو تاریخ وَرثے میں ملی ہے وہ آج اس کا مستند ثبوت فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ کتابوں میں یہ بھی درج ہے کہ ان کا شجرۂ نسب والد کی طرف سے امیر المومنین عمر بن خطابؓ سے جا ملتا ہے اور اس نسبت کے آگے دنیا کے تمام شاہی خاندانوں کی نسبتیں مل کر بھی ہیچ ہیں۔ اسی طرح بعض کتابوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن کی ایک بیٹی ان کی بیویوں میں سے ایک تھی۔ اس کا قطعاً کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔ مصدقہ بات صرف اتنی ہے کہ ان کی ایک سے زیادہ بیویاں تھیں جیسے ان کے مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور ان کے مرشد کے مرشد خواجہ معین الدین چشتی کی بھی دو دو بیویاں تھیں۔ خواجہ صاحب کی دونوں بیویوں کی قبریں تو

ان کے روضے کے احاطے میں آج بھی اجمیر میں موجود ہیں۔

چوتھی بات یہ مشہور ہے کہ ان کے ملتانی زبان کے اشعار سکھوں کی مذہبی کتاب گرنتھ صاحب میں شامل ہیں۔ گرنتھ صاحب فرید الدین مسعود کی رحلت کے کوئی سوا چار سو برس بعد، یعنی ۱۶۰۰ء کے لگ بھگ، سکھوں کے گرو ارجن دیو نے پایہ تکمیل تک پہنچائی تھی۔ اس میں ایک علیحدہ باب میں بعنوان ''شلوک فرید جی کے'' قدیم بلکہ متروک، ملتانی زبان میں ایک سو تیس اشلوک ہیں۔

اشلوک عام طور پر دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے جسے ہمارے شعر کے مترادف سمجھیے۔ ان اشلوکوں کے بارے میں تین باتیں جاننا ضروری ہیں۔ پہلی یہ کہ ان میں سے اکثر اشلوکوں، یا شعروں، کے بیشتر الفاظ موجودہ ملتانی، یا پنجابی، زبان میں اب رائج نہیں رہے۔ بعض جگہ قواعد کا بھی نمایاں فرق ہے، بعض اشلوکوں میں جن پرانی پنجابی رسومات کا ذکر ہے وہ کبھی کی متروک ہو چکی ہیں۔ چنانچہ اب پنجابی دان قارئین کے لیے بھی یہ اشعار تشریح اور پرانی لغت کے بغیر سمجھنا آسان نہیں۔ دوسری یہ کہ یہ اشعار اپنی اصلی حالت میں، صدیوں پہلے، تو یقیناً عربی رسم الخط میں لکھے گئے ہوں گے لیکن اب عربی رسم الخط میں لکھے ہوئے ان اشعار کے کسی مسوّدے کا اتا پتا ملتا ہے، نہ ہی اس کا ذکر فرید الدین مسعود کے ہم عصروں کے ملفوظات یا تاریخ میں ملتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر سکھوں کے گرو حضرات ان اشعار کو گرمکھی رسم الخط میں منتقل کر کے اپنی مذہبی کتاب میں جگہ نہ دیتے تو یہ اشعار آج تحریری شکل میں موجود نہ ہوتے۔ تیسری اور عجیب تر بات یہ ہے کہ گرنتھ صاحب کے مذکورہ بالا باب کا عنوان تو ضرور ''شلوک فرید جی کے'' ہے لیکن اس باب کے ایک سو تیس اشلوکوں میں سے ایک سو بارہ اشلوک تو فرید جی سے منسوب ہیں، پر اٹھارہ اشلوک سکھوں کے مختلف گرو حضرات کے تصنیف کردہ ہیں۔ چنانچہ اب یہ بحث چھڑ گئی ہے کہ آیا یہ ایک سو بارہ اشلوک بھی واقعی فرید الدین مسعود کے ہیں یا کسی اور کے؟ کچھ کا خیال ہے کہ ان اشلوکوں کے اصل خالق جنھیں گرنتھ صاحب میں فرید جی کہا گیا ہے، فرید الدین مسعود کے بارھویں خلیفہ شیخ ابراہیم ہیں جو علم اور تقویٰ کی وجہ سے فرید ثانی کے لقب سے مشہور اور سکھ مسلک

کے بانی گرو نانک کے ہم عصر تھے۔ اس رائے کے حامی، گرنتھ صاحب کے اِن ایک سو بارہ اشعار میں سے بعض اشعار اپنے موقف کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ سارا کلام فرید الدین مسعود کا ہی ہے جس کا مسودہ نسلاً بعد نسلٍ ان کے خاندان میں محفوظ چلا آرہا تھا اور جب گرو نانک فریدِ ثانی سے ملے تو فریدِ ثانی نے گرو نانک کی فرمائش پر اپنے جدِ امجد کا یہ سارا کلام ان کی نذر کر دیا۔ گو یہ بات قرین قیاس نہیں لگتی لیکن اس کی تائید میں بھی گرنتھ صاحب کے ان ایک سو بارہ اشعار میں سے بعض اشعار پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ بعض دیگر اصحاب کا خیال ہے کہ ان اشعار میں سے کچھ فرید الدین مسعود کے اور باقی فریدِ ثانی کے ہیں۔ ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ اور بہت سی روایتوں کی طرح یہاں بھی کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی۔ تاہم جس بات میں کسی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں وہ یہ ہے کہ گرو نانک کو فرید الدین مسعود سے بہت عقیدت تھی جس کی ایک جیتی جاگتی شہادت تو وہ گردوارہ ہے جو آج بھی چاولی مشائخ ضلع وہاڑی میں ان کے چلّے کی (ضعیف) روایت کے حامل اس کنویں کے عین سامنے موجود ہے جس کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ گردوارہ اس جگہ بنایا گیا ہے جہاں گرو نانک نے عبادت کی تھی۔

قارئین کو تجسّس ہوگا کہ یہ اشلوک ہوتے کیسے تھے؟ ان ایک سو بارہ اشلوکوں میں سے تین، منظوم ترجمے کے ساتھ، پیشِ خدمت ہیں:

* گرنتھ صاحب کا اشلوک نمبر ۱۱

اکھّیں دیکھ پتینیاں، سُن سُن رِینے کن
ساکھ پکندی آئی آ، ہور کریندی وَن

ترجمہ:

"پڑ گئی تھک کے ماند بینائی
دے گئی ہے جواب شنوائی
فصل پکنے کو آرہی ہے اب
رنگ میں ہو رہی ہے تبدیلی"

٭ اشلوک نمبر ۱۹

جنگل جنگل کیا بَھویں؟ وَن کنڈا موڑیں
وسّی رب ہِیا لیے جنگل کیا ڈھونڈیں

ترجمہ:

''جنگل جنگل پھرتا ہے کانٹوں کو تو روندتا ہے
رب تو بسے ہے من میں ترے، جنگل میں کیا ڈھونڈتا ہے؟''

٭ اشلوک نمبر ۲۸

روٹی میری کاٹھ کی، لَاون میری بُھکھ
جِنھاں کھادی چوپڑی، گھنے سہنِ گے دُکھ

ترجمہ:

''روٹی میری کاٹھ کی اور سالن میرا، بھوک
جو چکنی چپڑی کھاتا ہے وہ دکھ بھی بہت اُٹھاتا ہے''

سکھ آج تک بابا فرید سے منسوب یہ ایک سو بارہ اشلوک، اپنے گردواروں میں، انتہائی عقیدت سے، تاشے باجے کے ساتھ گاتے ہیں اور ان اشلوکوں کی ویسی ہی تعظیم کرتے ہیں جیسی مسلمان قرآنی آیات کی کرتے ہیں۔ پٹیالے میں قائم بابا فرید میموریل سوسائٹی نے، نومبر ۱۹۷۳ء میں ان کا آٹھ سو سالہ جشن ولادت، دہلی اور اجمیر میں بڑے تزک و احتشام سے منایا، جہاں اُردو کے مشہور سکھ شاعر کنور مہندر سنگھ بیدی سحؔر نے یہ نظم پیش کی:

اے فرید الدین بابا اے مرے گنجِ شکر
عالمِ الحاد تیرے خوف سے زیر و زبر

تو نے بخشا اک جہاں کو بادۂ عرفاں کا نور
زُہد کا، اخلاص کا، تسلیم کا، ایماں کا نور

راہِ حق سے اور حق سے تھی شناسائی تری
اس لیے ہوتی ہے ہر دِل میں پذیرائی تری

ٹوٹ سکتا ہے نظامِ انجم و شمس و قمر
اور مٹ سکتے ہیں دُنیا سے یہ دشت و بحر و بر

لیکن اے گنجِ شکر تو زندہ و پائندہ ہے
کل بھی تابندہ رہے گا آج بھی تابندہ ہے

پانچویں مشہور بات ان کی بے مثال ریاضت اور بے شمار کرامات کے بارے میں ہے۔ اللہ اپنے خاص بندوں کو، منتخب کرنے اور ان کے سینے کھولنے کے بعد، جو قوتیں عطا کرتا ہے ان کی بدولت ایسی ریاضتیں کرنا یا ایسی کرامات کا ظاہر ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ ایک معمولی آدمی کے لیے، جسے یہ قوتیں عطا کی گئی ہوں نہ ان کا اِدراک، یہ کرامات غیر معمولی ہوسکتی ہیں لیکن ان غیر معمولی انسانوں کے لیے اصل مشکل ان کرامات کا اظہار نہیں، اخفا ہے۔ ایک بار ان کے چھوٹے بھائی شیخ نجیب الدین متوکل نے، جو خود بھی ابدال کا درجہ رکھتے تھے، پوچھا ''بھائی جان ! کیا آپ کے پاس مردانِ غیب آتے ہیں'' جواب میں کہا ''میرے پاس تو تم آتے ہو اور تم ابدال کا درجہ رکھتے ہو۔'' اقرار نہ انکار۔ فرید الدین مسعود کے بارے میں دیگر مشہور روایات کی طرح یہاں بھی یہی کہنا مناسب ہوگا کہ ہم نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کرامات سرے سے ہوئیں نہیں اور نہ یہ کہ یہ ضرور ہوئی ہوں گی۔ مردانِ غیب بھی عالمِ غیب کی اجازت کے بغیر آسکتے ہیں، نہ کچھ بتا سکتے ہیں اور نہ کچھ کر سکتے ہیں۔ غیب کی باتیں غیب جاننے والے پہ چھوڑنا ہی بہتر ہے۔ جب خبر کا صحیح علم ہی نہ ہو تو اس پر رائے زنی کیسی !

چھٹی بات ان کی جائے ولادت کے نام اور محل وقوع کے بارے میں ہے۔ مختلف کتابوں میں، مختلف حروف، ہجوں اور املا کے ساتھ، اس کے کم از کم چھبیس مختلف نام درج ہیں۔ یہ سب نام جو 'ک' یا 'کھ' سے شروع ہوتے ہیں، درج ذیل ہیں۔

''ک'' سے	''کھ'' سے
(۱) کہتوال	(۱) کھتوال
(۲) کہتوالا	(۲) کھتوالہ
(۳) کہوتووال	(۳) کھوتووال
(۴) کوتیوال	(۴) کھوتیوال
(۵) کوٹھی والا	(۵) کھوٹے وال
(۶) کہولووالی	(۶) کھولووال
*(۷) * کوتھے وال	*(۷) کوٹھے وال
(۸) کہتی وال	(۸) کھلی وال
(۹) کہنی وال	(۹) کھن والا
(۱۰) کوتوال	
(۱۱) کوتھی	
(۱۲) کسووال	
(۱۳) کسوتر وال	
(۱۴) کہووال	
(۱۵) کہوتیوال	
(۱۶) کہتیوالہ	
(۱۷) کہوتیوالہ	

فرید الدین مسعود کے ایک بہت چاہنے والے اور چہیتے مرید سید محمد کرمانی تھے جن کے پورے خانوادے کو فرید الدین مسعود سے انتہائی عقیدت تھی۔ سید محمد کرمانی کے

ایک پوتے کا نام بھی سید محمد کرمانی تھا لیکن وہ امیر خورد کرمانی کے لقب سے مشہور ہیں، وہ خواجہ نظام الدین اولیاء کے ایک بہت چاہنے والے اور چہیتے مرید تھے۔ امیر خورد کرمانی نے خواجگان چشت کے بارے میں ''سیر الاولیا'' کے نام سے ایک مشہور اور مقبول کتاب لکھی ہے جو فرید الدین مسعود کے بارے میں قدیم ترین مستند ماخذوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں آپ کی جائے ولادت کا نام، ایک سے زیادہ بار، ''کھوتیوال'' یا ''کھوتیوالہ'' لکھا گیا ہے اور خواجہ نظام الدین اولیاء کا یہ قول بھی درج ہے کہ فرید الدین مسعود کی جائے ولادت ملتان کے نزدیک تھی۔ اسی طرح کا ایک قدیم اور مستند ماخذ ''خیر المجالس'' نام کی کتاب ہے جو خواجہ نظامِ الدین اولیاء کے خلیفہ نصیر الدین چراغ دہلی کے ملفوظات پر مشتمل ہے۔ اس میں صراحتاً یہ تحریر ہے کہ فرید الدین مسعود کے والد جس قصبے کے قاضی تھے' اس کا نام ''کو تھے وال'' تھا۔

ملتان کے شمال میں' شہر سے دس میل دور، بودلہ جانے والی سڑک، پر آج بھی، ''کوٹھے وال'' نامی قصبہ آباد ہے۔ اس کی جامع مسجد کے احاطے میں ایک مزار ہے جس کی لوح پر فرید الدین مسعود کے والد جمال الدین سلیمان کا نام لکھا ہوا ہے۔ اس مزار پر، تین چار برس پہلے تک، چھے ستونوں والی ایک پختہ چھتری ہوا کرتی تھی۔ اب اس پر مقبرہ بن چکا ہے۔

اگر ملتان کے نزدیک ''کوٹھے وال'' یا اس سے ملتے جلتے نام کا کوئی اور قصبہ بھی ہوتا تو یہ سوال ضرور اٹھتا کہ ان میں سے کون سی جگہ فرید الدین مسعود کی جائے ولادت ہے، تاہم اس طرح کی کوئی شہادت ہمارے سامنے نہیں۔ رہا نام کے تلفظ، حروف، ہجوں اور املا میں فرق، تو سات صدیوں کے دوران لکھے جانے والی مختلف کتابوں میں ایسے معمولی اختلاف پایا جانا کوئی حیرت کی بات نہیں، حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ سات صدی قبل لکھے جانے والی کتاب ''خیر المجالس'' میں جائے ولادت کا نام ''کو تھے وال'' اور قصبے کا موجودہ نام ''کوٹھے وال'' ہے۔ واضح رہے کہ فارسی میں ''ٹ'' کو بولا جاتا ہے نہ لکھا جاتا ہے اور اس کی جگہ ''ت'' استعمال ہوتی ہے۔

ان حقائق وشواہد کی بناء پر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ فرید الدین مسعود کی جائے ولادت کا شرف موجودہ ''کوٹھے وال'' کو جاتا ہے جس کا نام ان کی ولادت کے وقت بھی یا تو یہی ہوگا ورنہ اس سے ملتا جلتا ہوگا ،اور نام کے معمولی سے فرق سے ،مقام کے تعین میں اختلاف کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

*****

سلسلۂ چشتیہ کے پانچ عظیم اولیاء اللہ میں سے چار ہندوستان میں آسودۂ خواب ہیں۔ خواجہ معین الدین چشتی اجمیر میں آرام کر رہے ہیں اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، خواجہ نظام الدین اولیا اور خواجہ نصیر الدین چراغِ دہلی، دہلی میں مدفون ہیں۔ ہماری یہ خوش نصیبی ہے کہ قدرت نے فرید الدین مسعود کی خاک کو ہماری آنکھوں کا سرمہ بنایا ہے، لیکن یہ خوش نصیبی پانے کے بعد اسے اپنی بدنصیبی نہ کہیں تو کیا کہیں کہ جس نور سے ایک عالم کو بصیرت ملی ہم نے اسے روایات کی گرہوں میں باندھ کر، اپنی بصارت پر بھی پردے ڈال دیئے اور اس وجودِ مسعود کے ساتھ، اپنی خوش عقیدگی سے کہہ لیجیے یا اپنی خود غرضی سے، وہ سلوک روا رکھا ہے جس کے لیے لغت میں صرف ایک ہی لفظ ہے: ظلم۔

ہم اللہ کے کلام پر ریشمی جزدان اور فرید الدین مسعود کے مزار پر ریشمی چادر چڑھا کر، اپنے زعم میں، دونوں کی طرف سے، اپنے سارے فرائض سے سبک دوش ہو گئے ہیں۔ اللہ کی یاد آتی ہے تو مصیبت کے وقت، اللہ کے دوستوں کی یاد آتی ہے تو بھی اپنی مطلب براری کے لیے...... پاک پتن جانا ہوتا ہے تو ان کی یاد کی کشش سے نہیں بلکہ اپنی نا آسودہ خواہشوں کی تکمیل کے لیے۔ وہ کروڑوں انسان جو پچھلے سوا سات سو برسوں میں اس مشہورِ زمانہ ''بابِ جنت'' سے گزرتے رہے ہیں، ان میں سے کتنوں کو وہاں سے گزرتے ہوئے، یا گزرنے کے بعد، یہ خیال آیا ہوگا کہ جس ہستی کی لحد کی پائنتی کے دروازے کا یہ مقام ہو کہ اس کی چوکھٹ پار کرتے ہی، ان کے اعتقاد کے مطابق، جنت میں داخلہ مل جاتا ہے، تو خود اس ہستی کا کیا مقام ہوگا جو یہ چوکھٹ پار کرتے ہی عین سامنے محوِ خواب ہے۔ کیا انہوں نے کبھی یہ سوچا کہ اگر اس مزار کی پائنتی کے دروازے

سے ایک دو سیکنڈ میں گزر کر یہ کچھ مل سکتا ہے، تو مولا کے حکم اور کرم سے خود صاحبِ مزار سے کیا کچھ نہیں مل سکتا؟ اور کیا اس صاحبِ مزار کی قدر و قیمت ہمارے لیے صرف یہ رہ گئی ہے کہ اس سے اپنی، جا اور بے جا، مرادیں مانگتے رہیں جو اس کا، ہمارا اور سب کا پیدا اور پرورش کرنے والا اپنے اس معصوم اور محبوب بندے کا بھرم قائم رکھنے کے لیے اب بھی اس کے دروازے کی چوکھٹ پر پوری کرتا رہتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اگر یہ مرادیں پوری نہ ہوں تو کیا صاحبِ مزار کی اصل قدر و منزلت کم ہو جائے گی؟ کاش لوگ سوچیں اور سمجھیں کہ اللہ نے فرید الدین مسعود کی مٹی اس زمین کو دے کر اس مملکتِ خداداد کو جس بیش بہا نعمت سے نوازا ہے، ہم نے اس کی کتنی کم، بلکہ غلط، قیمت لگائی؟ کتنی کم تر قدر جانی؟ اور کتنا کم ترین مصرف سمجھا؟ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ صبح کے سہانے سمے کوئی کسی مینارے سے ہر سُو بانگ دے کہ اللہ کے بندو! اللہ کے واسطے اس نحیف و نزار جسم اور لطیف روح کے مالک کو چڑھاوے کی چادروں کے بوجھ سے نکالو، آؤ اور اس عظیم شہ باز کو منّت کے دھاگوں کے پھندوں سے آزاد کریں۔ درویشی کی اس شمع کو اپنی اَبدی لو تیز کرنے کے لیے تمہاری مرادوں کی کترنوں کی حاجت نہیں۔ اس نے تمہیں زندگی بھر بہت کچھ دیا اور وصال کے بعد بھی اس سخی کا ہاتھ تمہارے لیے کھلا ہے۔ اس ہاتھ پہ اپنے خلوص و محبت کے مہکتے پھول رکھو اور اس مرقد مسعود پر سوز و درد کی نیاز چڑھاؤ اور پھر اس حسنِ سیرت اور صورت کی ایک جھلک خود بھی دیکھو اور ایک دُنیا کو بھی دکھاؤ جس پہ نیلی چھتری والے اور سبز گنبد والے ﷺ کا سایہ قائم ہے اور دائم رہے گا۔

حق فرید یا فرید   حق فرید بابا فرید

*****

فرید الدین مسعود کی جھلک دیکھنا بڑی سعادت اور دکھانا بڑی جسارت کا کام ہے۔ وہ اللہ کے دوست، اس کے بندوں کے دوست اور علم دوست تھے۔ وہ نابغہ رُوزگار (Genius) تھے۔ ان کی صلاحیتیں فطری بھی تھیں اور اکتسابی بھی۔ انہیں بہ یک وقت چار

زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ کابل چھوڑنے کے بعد، ان کے دادا، لاہور اور قصور میں ٹھیکیاں لگاتے، بالآخر ملتان سے دس میل دور کوتھے وال میں آ کر آباد ہو گئے۔ نہ آتے تو آج کوتھے وال کا نام کس نے سنا ہوتا؟ فارسی کابل میں عرصہ دراز تک امراء اور شرفاء کی زبان رہی ہے اور یہی زبان، آٹھ سو برس پہلے، فرید الدین مسعود کے گھرانے کی زبان تھی جس میں وہ اپنی والدہ، بیویوں، بہن بھائیوں، بیٹی بیٹوں اور پوتے پوتیوں سے بات چیت کرتے تھے۔ فارسی اس دور کے برِ صغیر کے تعلیمی اداروں کی تدریسی زبان بھی تھی چنانچہ وہ اسی زبان میں اپنے طالب علموں کو اپنے جماعت خانے میں درس دیتے تھے۔ فارسی اس دَور کی علمی زبان بھی تھی چنانچہ وہ اسی زبان میں اپنے پیر، مشائخ، ذی قدر ہم عصروں اور ذی علم مریدوں سے خط و کتابت اور گفتگو کیا کرتے تھے۔ فارسی سلطنتِ دہلی کی سرکاری زبان بھی تھی چنانچہ اگر کبھی سلطانِ دہلی، اس کے وزراء یا افسروں کو کچھ لکھنے کی نوبت آتی یا کہنے کی ضرورت پڑتی تو فارسی زبان ہی استعمال ہوتی۔ فارسی اس دَور کی ادبی زبان بھی تھی اور فرید الدین مسعود ایک انتہائی حساس دل، اعلیٰ دماغ اور پاکیزہ ادبی ذوق کے مالک تھے۔ کچھ عجب نہیں کہ جب طبیعت موزوں ہوتی ہو تو فارسی میں شعر کہتے ہوں۔ ایک فارسی شعر جو ان سے منسوب کیا جاتا ہے، یہ ہے ؎

گر وصالِ شاہ می داری طمع
از وصالِ خویشتن مہجور باش

ترجمہ: ''اگر تجھے بادشاہ سے ملنے کی طمع ہے تو خود کو پانے میں ناکام ہو جا۔''

عربی زبان اس دَور کے مذہبی علوم کا خزانہ اور اس خزانے کی کنجی تھی۔ فرید الدین مسعود اس خزانے کے امین بھی تھے، کلید بردار بھی اور زبان کے مزاج شناس بھی، وہ قرآن کے معانی اور اس کی روح کے رمز شناس بھی تھے اور تجویدِ قرآن کی باریکیوں سے آشنا بھی۔ خواجہ نظام الدین اولیاء نے حرف ''ض'' کی صحیح قرأت، دہلی کے اعلیٰ دینی مدرسوں میں نہیں بلکہ اجودھن کے جماعت خانے میں فرید الدین مسعود سے سیکھی۔

ملتانی اتنے پرانے زمانے سے جس کا تعین ممکن نہیں، سرائیکی خطے کی بولی رہی

ہے۔ فرید الدین مسعود کی زندگی کا بیشتر حصہ اسی خطے میں گزرا۔ ان کا بچپن اور لڑکپن کوٹھے وال میں، نوجوانی ملتان میں اور بڑھاپا اجودھن میں کٹا، جو سب سرائیکی علاقے میں ہیں۔ وہ جب اس خشک، بنجر، گرم، اور ریتیلے علاقے کے عام لوگوں سے باتیں کرتے تو یہ گفتگو سرکاری زبان میں ہوتی نہ درباری زبان میں، علمی زبان میں نہ اپنی مادری زبان میں، عربی میں نہ فارسی میں، بلکہ ان لوگوں کی اپنی زبان میں ہوتی۔ وہ ٹھیٹ ملتانی میں ان کے مسائل ان سے سنتے اور اسی زبان میں، اپنے میٹھے، ملائم، مدھم لہجے میں، انہیں ان مسائل کا حل بتاتے۔ اس علاقے میں طویل قیام اور اپنی فطری ذہانت کی وجہ سے، انہوں نے آخری عمر میں ملتانی زبان پہ اتنی دسترس حاصل کر لی تھی کہ بیسویں صدی عیسوی کے پنجابی شعر و ادب کے بڑے بڑے نام، خواہ وہ مشرقی پنجاب میں بسنے والے سکھ ادباء اور شعراء ہوں یا مغربی پنجاب میں رہنے والے مسلمان علماء و فضلا، انہیں ملتانی (اور پنجابی) زبان کا سب سے پہلا شاعر گردانتے ہیں، ایک صاحبِ طرز شاعر جس کے اشعار اس قدیم اور عظیم زبان کا قدیم ترین اور عظیم ترین لوک وِرثہ ہیں۔ اپنے درد سے تڑپتے اور سوز سے سلگتے اشعار میں، وہ اس زمانے کی ملتانی زبان کے سیدھے سادے الفاظ میں، مغربی پنجاب کے اس ماحول اور معاشرت کی نمائندگی کرتے ہیں جس میں انہوں نے اپنا بڑھاپا گزارا۔ ایک موقر ناقد کے الفاظ میں ''وہ پنجاب کی فضا کی (کے) خاص نمائندے ہیں۔ وہ دریاؤں، ان کی طغیانیوں، بے پناہ ''ڈھاہوں'' بیڑیوں، ملاحوں، بیلوں، جنگلوں، جنگلی پھلوں، جنگلی ''ماکھیوں'' اور ریگزاروں کے نقشے ہمارے سامنے لاتے ہیں۔'' ان سے منسوب ملتانی (اور پنجابی) زبان کے نمونے گرنتھ صاحب کے اشلوک نمبر ۱۱، ۱۹ اور ۲۸ کی صورت میں اس سے پہلے پیش کیے جا چکے ہیں۔ یہ شاعری سر سے پاؤں تک سوز و درد کے لبادے میں لپٹی ہوئی ہے۔ اس میں سب سے زیادہ ذکر بڑھاپے کا ملتا ہے اور انسان کی محرومیوں، دنیا کی بے ثباتی اور موت کے نقشے، نزاکتِ خیال، شدتِ احساسات اور گمبھیرتا سے کھینچے گئے ہیں۔ اس ساز کی لے صرف وہی قادر الکلام شاعر بلند کر سکتا ہے جس کا اپنا دِل سوز کی دہکتی ہوئی بھٹی میں تپ رہا ہو۔

یہی وہ تاریخ ساز، تہذیب ساز، عہد ساز اور زبان ساز دَور تھا جب دہلی اور اس کے گرد و نواح میں مسلمان فوجیوں اور مقامی ہندوؤں کے باہمی ربط ضبط سے ایک بالکل نئی اور عوامی زبان کی نرم و نازک کونپلیں پھوٹ رہی تھیں جس نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک سدا بہار، خوشبودار، گھنا اور تناور درخت بن کر، فرید الدین مسعود کی عہد آفریں شخصیت کی طرح اس پورے برِ صغیر کو اپنی ٹھنڈی چھاؤں میں لے لیا۔ جب نوجوان فرید الدین مسعود اپنے مرشد کی خدمت میں دہلی پہنچے تو یہ زبان وادیٔ گنگ و جمن کے پنگورے میں ابھی اپنے انگوٹھے چوس رہی تھی۔ فرید الدین مسعود کچھ عرصے دہلی میں رہنے کے بعد ساٹھ میل دور ہانسی چلے گئے جو اس زمانے میں فوجی چھاؤنی تھی۔ آپ کا قیام وہاں دس برس سے زیادہ رہا۔ ترکی زبان میں فوجی لشکر کو ''اردو'' کہتے ہیں اور برِ صغیر میں طورخم سے راس کماری اور جیوانی سے کاکسز بازار تک اس خطے کے عوامی رابطے کی اس عظیم ترین زبان کا نام بھی بالآخر یہی پڑنا تھا۔

فرید الدین مسعود کا تعلق عمر بھر عام آدمی سے رہا۔ ان کا دل صرف عوام کے لیے نہیں، بلکہ عوام کے دلوں کے ساتھ دھڑکتا تھا۔ انہوں نے گنواروں، سپاہیوں اور شہریوں میں رابطہ پیدا کرنے والی یہ عوامی بولی اس چاہت سے اپنائی کہ اسے بولی سے اٹھا کر زبان کا درجہ دیا۔ اُردو کے کئی مستند اہلِ قلم اور محققین کی رائے میں فرید الدین مسعود، صرف ملتانی کے نہیں بلکہ اُردو کے بھی پہلے شاعر ہیں۔ انجمن ترقی اُردو کے مرحوم صدر ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے مطابق اُردو زبان کا پہلا شعر فرید الدین مسعود کا ہی کہا ہوا ہے۔ شعر یہ ہے ؎

وقت سحر وقت مناجات ہے
خیز دراں وقت کہ برکات ہے

اسی طرح گرنتھ صاحب کا اشلوک نمبر ۲۹ جو خاصا مشہور اور فرید الدین مسعود سے منسوب ہے، یوں ہے ؎

رُکھّی سُکی کھاءِ کے ٹھنڈا پانی پیءِ

دیکھ پرائی چوپڑی نہ ترسائیں جی ءِ

ترجمہ:

''روکھی سوکھی کھا کے ٹھنڈا پانی پی

پرائی چپڑی تک کے نہ کرمیلا جی''

یہ شعر، مندرجہ بالا موجودہ شکل میں، گرمکھی رسم الخط سے دوبارہ عربی رسم الخط اور تلفظ میں تبدیل کر کے لکھا گیا ہے، اس کے باوجود، سیکڑوں برس پہلے کہے گئے، اس شعر کے الفاظ آج بھی کانوں کو اجنبی نہیں لگتے۔

کسی زبان میں لافانی شعر وہی کہہ سکتا ہے جسے اس زبان سے سچا پیار بھی ہو اور اس پر مکمل عبور بھی۔ عربی، فارسی، اُردو اور ملتانی زبانیں برِ صغیر کے اس نابغہ ٔروزگار کے حَرَمِ علم و ادب کی محبوب کنیزیں تھیں۔ مذہب کی بات چھڑتی تو زبانِ عربی کی ''جاریہ'' حاضر۔ عزیزوں، ہم عصروں اور طلبا سے محوِ گفتگو ہیں تو زبانِ فارسی کی کنیز دست بستہ ایستادہ۔ گوڑ گاؤں کے گنواروں، دہلی کے شہریوں اور ہانسی کے فوجیوں سے باتیں ہوتیں تو زبانِ اُردو کی نوخیز لونڈی ہاتھ باندھے موجود۔ ملتان، کوتھے وال اور اجودھن کے باسیوں سے ''گل بات'' چل رہی ہوتی تو ملتانی زبان کی باندی حاضرِ خدمت۔ زبان تو صرف اظہارِ خیال کا ذریعہ تھی، حقیقت میں تو ان کے اندر اللہ بول رہا ہوتا تھا۔

*****

وہ کم بولتے، بہت کم اور بہت سادہ کھاتے اور بہت ہی کم سوتے تھے۔ اپنی ذات کے متعلق کوئی اچھی بات بتانی ہوتی تو ایسے ذکر کرتے جیسے کسی اور کی بات ہو رہی ہو اور فرماتے کہ اس موقع پر ایک درویش نے یوں کیا تھا۔ جہاں اپنی کوئی کوتاہی بتانی ہوتی تو جھٹ کہتے کہ اس بندے سے فلاں وقت فلاں غلطی سرزد ہوئی تھی۔ وہ شہرت سے جتنا پرے بھاگتے، شہرت اتنا ہی ان کے پیچھے بھاگتی۔ دولت سے انہیں نفرت تھی اور دُنیا اور دولت ان پہ واری قربان ہوتی تھیں۔ مسلسل روزے رکھتے تھے کیوں کہ ان کا اعتقاد اور تجربہ تھا کہ روح کی پاکیزگی اس کے بغیر ممکن نہیں۔ ایک دفعہ فرمایا کہ روزہ اللہ اور

بندے کے درمیان ایک راز ہے۔ یہ روزے ہمارے روزوں کی طرح نہ ہوتے تھے جو بعض اوقات وزن گھٹانے اور اکثر ایک خوشگوار فرض کو ناخوشگوار قرض کی طرح چکانے کے لیے رکھے جاتے ہیں اور جہاں سارا زور بھوک اور پیاس کی شکایت، دماغ کے ضعف، جسم کی نقاہت، افطار کے وقت چٹ پٹی چاٹ، گرم پکوان، ٹھنڈے اور چٹخارے دار دہی بڑوں، سحری کے وقت جلیبیوں، کھجلوں اور پھینیوں اور افطار اور سحری کے درمیان گھی سے تر بتر پراٹھوں، روغنی پھلکوں اور نت نئے، مزے دار، ثقیل اور مرغن کھانوں پر ہوتا ہے جو جسم کے لیے مضر، جیب اور رُوح پہ بار اور روزے کی روح کے خلاف ہوتے ہیں۔ رات جب سارا سنسار سو رہا ہوتا وہ جاگ رہے ہوتے۔ وَالیّلِ اِذَاسَجیٰ (اور قسم ہے رات کی جب وہ ساکن ہوجائے۔) مَاوَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلیٰ (تمہارا رب نہ تم سے ناراض ہوا اور نہ اس نے تمہیں چھوڑا۔) اجودھن کی رات کے مکمل سناٹے میں وہ کبھی سجدہ ریز ہوتے، کبھی اشک بار۔ کبھی بے قراری کے عالم میں، ہاتھ پیچھے باندھے، اپنے چھوٹے سے کچے حجرے میں چہل قدمی کرنے لگتے اور فارسی کے دل پسند عارفانہ اشعار خود بخود ان کی زبان پہ جاری ہوجاتے۔ سجدے میں بھی اپنے محبوب سے پیار، محبت اور راز و نیاز کی باتیں جاری رہتیں اور اشعار کے جام بھی اپنے محبوب کی آرزو سے لبالب بھرے ہوتے۔ وہ اپنے من موہنے، میٹھے، پرسُوز لہجے میں چپکے چپکے اپنے محبوب سے کہتے جاتے: ''میرے محبوب! میری اب بس ایک ہی آرزو رہ گئی ہے، جب تک جیوں تیری یاد میں جیوں، اور جب مروں تو تیرے قدموں میں گر کر زندہ ہوجاؤں۔ دونوں جہاں میں تیرے سوا میرا بھلا اور کون ہے؟ میں جیتا ہوں تو تیرے لیے اور مرتا ہوں تو تیرے لیے۔'' رات جیسے جیسے ساکن ہوتی جاتی فرید الدین مسعود کی بے چینی بڑھتی جاتی۔ ''روشنیِ محفل دو جہاں ﷺ سے لو پانے اور لو لگانے والی درویشی کی یہ پاکیزہ شمع جب اپنے سوزِ دروں سے کچھ زیادہ ہی تپاں ہوجاتی تو اس کی لو سراپا لرزاں ہوجاتی اور اس کے بے کراں درد کے شجر کے سائے اس کے چھوٹے سے حجرے کی چار دیواری سے نکل کر مشرق مغرب شمال جنوب، اوپر نیچے، ہر طرف لمبے سے لمبے اور گہرے سے گہرے ہوتے

جاتے۔ وجد کا عالم طاری ہو جاتا اور حجرے میں رقص کرنے لگتے۔ بے چینی بڑھتی جاتی اور رات اور ساکن ہوتی جاتی۔ جب رب المشرقین و مغربین اپنے کسی بندے پہ اپنے فضل کی بوچھاڑ کرتا ہے تو یہی ہوا کرتا ہے۔ یہ وجد ایک فرد پہ تھا نہ یہ رقص ایک فرد کا، یہ وجد ایک عالم پہ، اور یہ رقص، رقصِ کونین ہوتا تھا جس میں ساری دوئیاں ختم ہو جاتی تھیں۔

رات ختم ہوتی، سحری کا وقت آتا، فرید الدین مسعود کی سحری روزے کی نیت ہوتی تھی۔ فجر کی اذان ہوتی تو حجرے کا لکڑی کا دروازہ آہستہ سے کھلتا۔ تاروں کی چھاؤں اور نسیمِ صبح گاہی کے عطر بیز جھونکوں میں وہ باہر آتے۔ ہونٹوں پہ ہلکا سا دل فریب تبسّم، نکلتا ہوا قد، صحت مند جسم، گندمی رنگ، اونچا ماتھا، بڑی بڑی روشن آنکھیں، چوڑے کندھے، فراخ سینہ، شب بھر کے رت جگے کے باوجود تر و تازہ گلاب کی طرح کھلا ہوا شاداب اور بھرا بھرا چہرہ جس سے نور بھی چھلکتا اور دبدبہ بھی ٹپکتا تھا، جسے دیکھ کر کشش بھی محسوس ہوتی اور رعب بھی طاری ہوتا تھا۔ چاندی اور چاندنی کی طرح سفید براق ڈاڑھی جو رخساروں پہ چھدری اور ٹھوڑی پہ گھنی تھی۔ ایک کرشماتی شخصیت جسے ایک بار دیکھ کر دوسری بار، دوسری بار دیکھ کر تیسری بار اور پھر بار بار دیکھنے کو جی چاہتا اور کبھی جی نہ بھرتا تھا۔ اپنی مدھم اور شیریں آواز میں لوگوں کو دعائیں دیتے، ان پہ سلامتی بھیجتے، حضور ﷺ کے حضور میں چپکے چپکے درود و سلام پیش کرتے، وہ کسی کے نشے میں چور، کسی کی دُھن میں مگن، وقار سے نپے تلے قدم اٹھاتے، فجر کی نماز پڑھانے مسجد کی طرف روانہ ہو جاتے۔ سیکڑوں مشتاق نظریں سر سے پاؤں تک ان کی بلائیں لیتیں۔ سیکڑوں با ادب ہاتھ ایک ساتھ سلام کے لیے اٹھتے۔ وقت تھم جاتا کہ امامِ وقت امامت کے لیے آ رہا ہے۔ نماز کیا پڑھاتے دلوں کی دنیا بدل ڈالتے۔ نماز ختم ہوتی تو وہ آہستہ سے اپنے پرانے مصلے سے اٹھتے اور نپے تلے قدم اٹھاتے پھر کسی کی دھن میں گم، اللہ کی مخلوق کی توجہ اور محبت کا مرکز، ان کی امیدوں کا سہارا، غموں کا مداوا اور درد کا مسیحا بنے، اپنے اس حجرے میں واپس چلے جاتے جہاں وہ آج بھی آرام کر رہے ہیں۔ دروازہ بند کر دیا جاتا اور اگلی دو گھڑی انسان

تو انسان کسی فرشتے کو بھی اندر پر مارنے کی اجازت نہ تھی۔ یہ وقت اس ایک ذات کے آگے اس ایک سجدے کے لیے وقف تھا جب مسعود اور اس کے معبود کے درمیان کسی غیر خیال کو بھی، غلطی سے، گزرنے کی اجازت نہ تھی۔ یہی وہ ایک سجدہ ہے جو قُدسی مقال اقبالؔ کے لافانی اور لاثانی الفاظ میں آدمی کو ہزار سجدوں سے نجات دلاتا ہے۔ جس میں اللہ کے آخری رسول ﷺ اپنے دوست سے کہا کرتے تھے "تیرے آگے، میرا تمام جسم اور خیال بھی سجدہ کرتا ہے۔" اس ایک لمبے سجدے کے دوران، ان کی زبان پہ کبھی بے ساختہ فارسی کے اشعار جاری ہوجاتے۔ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے جاتے، زمین پر بار بار اپنی مقدس پیشانی رگڑتے جاتے اور یہ اشعار پڑھتے جاتے۔

خواهم که همیشه در هوائے تو زِیم
خاکے شَوم و بزیرِ پائے تو زِیم

مقصودِ مِنِ بنده زِ کونین توئی
از بهرِ تو مِیرم از برائے تو زِیم

ترجمہ: "میری آرزو ہے کہ جب تک جیوں تیری ہی دُھن میں جیوں اور جب خاک ہوجاؤں تو تیرے قدموں میں زندہ ہوجاؤں۔ دونوں جہاں میں مجھ بندے کا مقصود تو ہی تو ہے۔ میں تیرے لیے مرتا اور تیرے ہی لیے جیتا ہوں۔"

در پسِ آئینه طوطی صِفَتم داشته اند
آنچه استاذِ ازل گُفت بگو می گویم

*****

آئینہ خواہ کتنا ہی صاف، شفاف اور مہنگا ہو، اس میں دیکھنے والے کو عکس تو ضرور نظر آتا ہے لیکن جس کا عکس نظر آتا ہے وہ آئینے میں نہیں، آئینے کے سامنے ہوتا ہے۔ آئینے کے اندر نہیں، باہر ہوتا ہے۔ انسانی عقل کے آئینے میں بھی خدا کا عکس نظر آتے تو سنا ہے، خدا کو پاتے دیکھا نہ سنا۔ اوپر والے تک پہنچنے کے لیے جو ہر کسی کی شہ رگ سے اتنا قریب

ہے کہ کسی کو نظر نہیں آتا، عقل کا زینہ چاہیے نہ خرد کا آئینہ، جو چاہیے وہ پُرنم آنکھ اور پُرسوز دل ہے جو فرید الدین مسعود کا سرمایۂ حیات تھے۔ ان پر ہر وقت خشیتِ الٰہی کا غلبہ طاری رہتا اور جس دل میں یہ ڈر ہو، اسے کسی کا کیا ڈر؟ اس سے تو ڈرانے والے ڈرا کرتے ہیں۔ بے حد رقیق القلب تھے۔ سماع میں کوئی اچھا شعر سنتے تو کیفیت طاری ہو جاتی، رسولِ کریم ﷺ کا ذکر آتا تو ان کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں عشقِ رسول ﷺ کی گھنگھور گھٹائیں چھا جاتیں اور آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ ایک دفعہ رسولِ کریم ﷺ کی وفات کا ذکر آیا تو روتے روتے بے حال ہو گئے۔ بہت دیر بعد سنبھلے تو سسکیاں لیتے ہوئے کہا کہ جن ﷺ کے واسطے تمام عالم کو پیدا کیا جب انہیں ﷺ کو اس عالمِ فانی میں نہ رکھا تو میں اور تم کون ہوتے ہیں جو زندگی کا دم بھریں۔ اپنی چال ڈھال، قرأت و عبادت اور گفتار و کردار میں اُسوۂ حسنہ ﷺ کی تقلید کرتے۔ اپنے بے شمار ملنے اور چاہنے والوں کے لیے گنج شکر کے شکر بار ہونٹوں پر بس ایک ہی دعا ہوتی ''اللہ تمہیں سوز اور درد عطا کرے، اللہ تمہیں سوز اور درد عطا کرے۔'' کچھ کی سمجھ میں آتا وہ بہت کچھ پا لیتے، کچھ کی سمجھ میں نہ آتا، کچھ کی سمجھ میں آج بھی نہیں آتا۔ ہمیشہ انتہائی پرسکون نظر آتے، لگتا تھا کہ اعصاب جیسے فولاد کے بنے ہیں، لیکن اس ساکن سطح کے نیچے سدا ایک محشرستان بپا رہتا، ایک طوفان موج زن رہتا جس کے بے قرار جوار بھاٹے کو ان کے اور ان کے اکلوتے رازداں کے سوا کوئی نہ جانتا تھا۔ ایک روز ان کا ایک مرید محمد شاہ غوری سخت پریشانی کے عالم میں آیا اور کہا ''شیخ! آپ تو جانتے ہیں کہ میرا گھر بار میرا بھائی چلا رہا ہے اور میں دُنیاوی فکروں سے نچنت یہاں عبادت میں مشغول ہوں، مگر میں اسے ابھی جاں کنی کے عالم میں چھوڑ کر آپ کے پاس دعا کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ اس وقت میرے اندر کی جو حالت ہے وہ میں محسوس کر سکتا ہوں، بیان نہیں کر سکتا۔'' فرمایا ''محمد شاہ غوری! اندر کی جو حالت تمہاری اس وقت ہے عمر بھر میری حالت وہی رہی ہے لیکن میں نے کسی پہ ظاہر نہیں ہونے دی۔ جاؤ تمہارا بھائی ٹھیک ہو گیا ہے اور اس وقت کھانا کھا رہا ہے۔'' (یہ بات درست نکلی۔) اپنے محبوب رسول ﷺ کے پاک قدموں کے منور نشانوں پہ چلتے

ہوئے ان کی زندگی کا مرکز ،محور اور مقصود صرف اور صرف اللہ کی ذات تھی۔ ان کا محبوب فارسی شعر جسے وہ اکثر گنگناتے رہتے تھے، اس کی واضح شہادتوں میں سے ایک ہے: "مقصودِ منِ بنده زِ کونین توئی" (مجھ بندے کا دونوں جہاں میں مقصود تو ہی تو ہے۔)"ازبھرِ تومیرم از برائے تو زِیم" (میں تیرے لیے مرتا اور تیرے ہی لیے جیتا ہوں۔)

وہ اللہ کی ایک آیت تھے اور انہیں ہروقت یہ احساس رہتا کہ وہ اللہ کے سامنے موجود ہیں۔ نماز پڑھتے تو لگتا جیسے وہ اپنے رب سے اور ان کا رب ان سے باتیں کر رہا ہو۔ اسی وجہ سے انہیں نماز پڑھتے دیکھ کر دیکھنے والوں پر دیر تک عجب سا اثر رہتا، جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔ ایک دن ان کے چھوٹے بھائی نجیب الدین متوکل نے جوخود بھی ایک پہنچے ہوئے بزرگ تھے، آخر پوچھ ہی لیا''بھائی جان ! لوگ کہتے ہیں کہ جب آپ نماز پڑھتے ہیں تو نماز کے دوران اللہ کو یہ کہتے سنتے ہیں''میرے بندے! میں تیرے پاس ہی موجود ہوں۔'' ان کی نمازیں جنت کی خواہش میں ہوتی تھیں، نہ جہنم کے خوف سے، وہ تو صرف اس وحدہ، لاشریک کی محبت میں ہوتی تھیں، جو ان کے وجود میں سمایا ہوا تھا، جس کے لاشریک ہونے کا تصور ان کے دل و دماغ پہ سورۂ اخلاص بن کرنقش تھا اور جس کے سوا وہ کسی اور کا سہارا نہیں چاہتے تھے۔ خواجہ نظام الدین اولیاء بتاتے ہیں کہ ایک روز فرید الدین مسعود اپنے عصا پہ ٹیک لگائے کھڑے تھے کہ اچانک چہرے کا رنگ بدل گیا اور عصا پرے پھینک دیا۔ مجھے حیرت ہوئی، سبب پوچھا تو گلو گیر لہجہ میں فرمایا''اس گناہ گار پہ ابھی عتاب ہوا تھا کہ بندے تو میرے بنتے ہو اور سہارا غیر کا لیتے ہو؟''

ظہر کی نماز کے بعد حجرے کا دروازہ کھول دیا جاتا۔ اللہ سے باتیں بہت ہوگئیں، اب اللہ کے بندوں کے کام کرنے کا وقت تھا۔ لوگ ایک ایک کر کے باری باری اندر جاتے اور اپنی اپنی مشکلات اور حاجات بتاتے۔ کسی کو اپنی جوان بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کا غم کھائے جا رہا تھا۔ کوئی کسی سرکاری افسر کی سختی سے نالاں تھا۔ کسی کو کوئی سرکاری ملازمت چاہیے تھی۔ کسی کا کوئی بھائی قریبِ مرگ تھا۔ آپ پوری دل جمعی سے

ہر ایک کی پوری پوری بات سنتے اور جب تک بات ختم نہ کرلیتا، روکتے نہ ٹوکتے۔ ان جیسا پیار بہتوں کو اپنے سگوں میں بھی نہ ملتا تھا۔ ہر ایک کی بپتا ایسے سنتے جیسے خود ان پہ بیت رہی ہو۔ ہر ایک کی دل جوئی کرتے، ہر ایک کی پوری اور فوری مدد کرتے۔ بھائی قریبِ مرگ ہے تو زندگی دینے والے سے اس کے لیے زندگی مانگ لی۔ بیٹیوں کی شادی کرانی ہے تو اچھے بَر کی دعا کے ساتھ رقم کا بھرپور عطیہ دے دیا۔ ملازمت چاہیے تو شکرانہ بٹوا دیا اور اسے بہت اچھی ملازمت مل گئی۔ کسی چھوٹے موٹے افسر سے کام ہے تو اسے رقعہ لکھ دیا، لیکن شاہانِ وقت سے سفارش کرنے سے بہت پرہیز کرتے۔ جب ایک سائل کا اصرار بہت بڑھا تو سلطان غیاث الدین بلبن کو یہ مختصر خط لکھا:

شاہِ دہلی بلبن کے نام!

میں نے اس شخص کا معاملہ پہلے اللہ کے حضور پیش کیا تھا اور اب اسی کے حکم سے تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ کچھ دے دو گے تو دینے والا وہ ہی ہے لیکن اجر تمہیں مل جائے گا۔ نہ دو گے تو روکنے والا وہ ہی ہے اور تم صرف معذور ہو گے۔'' اس خط کے الفاظ پہ غور کیجئے اور پھر ایک اُمّی علیہ وسلم کے ان الفاظ پر:

اَللّٰھُمَّہ لَا مَانِعَ لِمَا اَعطیتَ (اے اللہ! کوئی نہیں روک سکتا جو تو عطا کرے۔)

وَلَامُعطِیَ لِمَا مَنعتَ (اور کوئی نہیں دے سکتا جو تو نہ دینا چاہے۔)

وَلَا یَنّفَعُ ذَی الجَدِّمِنكَ الجدّ ٥ (اور کسی بڑے کی بڑائی تیرے سامنے کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔)

کہنے والے کی زبان کبھی اللہ کی زبان بن جاتی، تو کبھی، اللہ کے حکم سے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان بن جاتی تھی۔

بلبن جیسے طنطنے اور دبدبے کا بادشاہ اس سے پہلے دہلی کے تخت پہ بیٹھا، نہ بعد میں۔ اس کے دربار میں بڑے بڑے فوجی سردار، وزراء اور امراء ہاتھ باندھے اور سر جھکائے گھنٹوں باادب کھڑے رہتے۔ کسی کو مسکرانے تک کی ہمت نہ ہوتی تھی اور خود سلطان کو کسی نے عمر بھر دربار میں ہنستے نہ دیکھا۔ روایت ہے کہ یہ تیکھا خط جب بلبن کو ملا

تو بھرے دربار میں باادب کھڑا ہوگیا۔ دونوں ہاتھوں سے خط وصول کیا، پڑھا، چوما، آنکھوں سے لگایا اور سر پر رکھ کر دربار میں رقص شروع کر دیا۔ کیوں نہ کرتا؟ کیا اسے وہ وقت یاد نہ تھا جب وہ اس قلندرانہ خط لکھنے والے فقیر کی کٹیا میں ننگے پاؤں، ننگے سر، ہاتھ باندھے، سر جھکائے، باادب، خاموش اور منتظر کھڑا تھا اور دہلی کا تخت و تاج دو لمحوں اور دو شعروں میں اسے عطا کر دیا گیا تھا۔

*****

ہر دربار کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ فرید الدین مسعود کے پاس جو بھی آتا کچھ نذرانہ لے کر آتا جو شام سے پہلے مستحقین میں بٹ جاتا۔ کوئی خالی ہاتھ آتا تو حکم تھا کہ آنے والا خالی ہاتھ آتو گیا ہے، خالی ہاتھ واپس نہ جانے پائے۔ سخی کے دربار کی یہ شان اور روایت آج بھی قائم ہے۔ خالی ہاتھ واپس جانے کی اجازت تھی، نہ ہے۔ کبھی کسی حاجت مند سے اپنے مخصوص شیریں لہجے میں ہولے سے کہتے ''جاؤ شکرانہ لے آؤ'' یہ اشارہ ہوتا کہ دعا قبول ہوگئی اور اللہ کے حکم سے مراد بَر آئے گی اور وہ بَر آتی۔ حاجت براری کے لیے کبھی قرآنی آیات کی تلاوت کا حکم دیتے، مثلاً ایک شخص نے معیشت کی تنگی دفع کرنے کے لیے دعا کی درخواست کی تو ہر جمعے کی رات سورۂ جمعہ پڑھنے کی تلقین کی، کبھی تعویذ دے دیتے، کبھی کوئی دعا بتا دیتے، بتانے والے کے بتانے کے بھی اپنے انداز تھے، کسی کو بالمشافہ تو کسی کو خواب میں۔ خواجہ نظام الدین اولیاء کو خواب میں آکر ایک دُعا بتائی اور روزانہ سو بار پڑھنے کی تلقین کی۔ وہاں تو انتظار ہی یہ رہتا تھا کہ کب حکم ہو، تاکہ استقامت سے فوراً اور کاملاً تعمیل ہو۔ بعد میں راز کھلا کہ اس دعا میں یہ برکت پنہاں ہے کہ ہر روز سو بار پڑھنے والے کو زندگی کی سب خوشیاں، کسی ظاہری سبب کے بغیر، ملتی چلی جائیں گی۔ غور کیجیے کہ ''ظاہری سبب کے بغیر'' خوشیاں عطا ہونے کے کیا معانی اور مطلب ہوسکتے ہیں؟ ان الفاظ کی قوت کا منبع کہاں ہے اور ان کی پہنچ کہاں تک ہے؟ خواجہ نظام الدین اولیاء کو زندگی میں جو طمانیت حاصل ہوئی ہے، وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ ان کی زندگی میں، ان کی خانقاہ کے لنگر کے لیے، نمک روزانہ بوریوں کے حساب سے اور

گوشت، پیاز اور ترکاری اُونٹوں پہ لد کر آتے تھے۔ روپے پیسے کی وہ ریل پیل تھی کہ رؤسا حیرت اور بادشاہ رشک میں رہے۔ خلقِ خدا کو اپنے سلطان جی سے وہ چاہ تھی کہ سلاطینِ دہلی میں سے کچھ کو سخت بغض اور حسد رہا۔ خواب میں بتائی ہوئی اور اسمِ اعظم جیسی تاثیر رکھنے والی یہ دُعا پروردگار کی ذات اور اس کی صفات کے بارے میں اُنیس سادہ، دل پذیر اور پُرشکوہ الفاظ پر مشتمل تھی۔ قرآنِ مقدس کی سورتوں سے اخذ کردہ اس کیمیا اثر دُعا کے الفاظ جو کلمہ توحید کا حصہ بھی ہیں، یہ تھے:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ المُلكُ وَلَهُ الحَمدُ وَهُوَّ عَلىٰ كُلِ شَئيِ ءٍ قَدِير٥

مخلوقِ خدا سے پیار اور ان کی حاجت روائی فرید الدین مسعود کی زندگی کا طرۂ امتیاز تھے۔ فرماتے تھے کہ جب تک میرے دَر پر ایک سوالی بھی موجود ہے مجھے عبادت میں لُطف نہیں آتا۔ بھلا کیسے آتا جب ان کے محبوب نبی ﷺ کو یہ حکم مل چکا تھا کہ ''سائل کو نہ جھڑکنا۔'' اگر کبھی معتقدین کی بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے ہر سائل سے فرداً فرداً ملنا مشکل نظر آتا تو حجرے سے باہر آ کر باآوازِ بلند پکارتے ''لوگو! میرے پاس ایک ایک کر کے آؤ تاکہ میں تم میں سے ہر ایک کے مسائل پر الگ الگ اور پوری پوری توجہ دے سکوں۔'' بندوں سے باتیں ختم ہوتیں تو فوراً اللہ سے باتیں شروع ہو جاتیں۔ اب وہی حجرہ اور وہی اللہ اور وہی بندہ اور وہی درد و سوز، اور وہی شعر اور سجدے، اور وہی سسکیاں، سبکیاں اور سرگوشیاں، راز و نیاز کی وہی محفلیں، عشق و سرمستی کی وہی مجلسیں، خلوتوں میں وہی جلوتیں اور جلوتوں میں وہی خلوتیں۔ یہاں تک کہ افطار کا وقت آ جاتا۔ افطاری شربت کا ایک پیالہ ہوتا جس میں سوکھی کشمش (منقہ) کے چند دانے پڑے ہوتے اور گھی میں چپڑی ہوئی سو سو گرام یا آدھ پاؤ وزنی جوار کی دو موٹی موٹی روٹیاں ہوتیں۔ شربت کے تہائی یا آدھے پیالے سے اپنی دن بھر کی پیاس بجھاتے، باقی آدھے یا دو تہائی پیالے کو گھونٹ گھونٹ پی کر، آبِ کوثر پینے کی تمنا دل میں لیے، کتنے لوگ، کہاں کہاں سے آئے، کب کب سے انتظار میں بیٹھے ہوتے۔ جوار کی ایک روٹی تبرکاً حاضرین میں بٹ

جاتی، دوسری روٹی کبھی تہائی اور کبھی نصف کھاتے، باقی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نصیبے والوں کے پیٹ میں چلی جاتی۔ نمازِ مغرب کے بعد پھر اپنے پروردگار سے راز و نیاز شروع ہو جاتے۔ پاک پتن کا آسمان تاروں سے بھر جاتا تو جماعت خانے میں عشائیے کے لیے زمین پر سرخ کپڑے کا دستر خوان بچھا دیا جاتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ عشائیہ تو ہے مگر دستر خوان نہیں، ایسے موقعوں پر عشائیہ زمین پر ہی چن دیا جاتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ دستر خوان تو ہے مگر عشائیہ نہیں۔ اور یہ عشائیہ ہوتا کیا تھا؟ خواجہ نظام الدین اولیاء کے الفاظ میں: ''جس رات ہمیں شیخ کے گھر پیٹ بھر کر ''ڈیلے'' کھانے کو مل جاتے، وہ ہمارے لیے عید کا دن ہوتا۔'' ڈیلے ایک جنگلی پھل کا نام ہے جو ان دنوں اجودھن کے آس پاس کے جنگلات میں ''کریل'' نام کے درختوں پر، جو بے شمار ہوا کرتے تھے، خوب اُگتا تھا۔ یہ درخت آج بھی پاک پتن کے قدیم قبرستان کے علاوہ دیپال پور کی شاہراہ پر نظر آتے ہیں۔ مقامی لوگ اس درخت کو اب ''کری'' کہتے ہیں لیکن اس کا پھل اب بھی ''ڈیلے'' ہی کہلاتا ہے۔ اور یہ کھانا پکتا کیسے تھا؟ اس طرح کہ یہ جنگلی پھل پھول پانی میں نمک ڈال کر ابال لیے جاتے۔ کھانے کے لیے یہ جنگلی پھل توڑ کر لانے کا کام فرید الدین مسعود کے بہت چہیتے مرید، نامور خلیفہ، اپنے وقت کے ابدال اور ہانسی کے باسی جمال الدین ہانسوی کے سپرد تھا۔ ڈیلے پکانے کے لیے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانے کا کام فرید الدین مسعود کے داماد، خادمِ خاص اور خلیفہ بدر الدین اسحٰق دہلوی کے ذمے تھا۔ ڈیلے ابالنے کا کام دہلی کی اعلیٰ ترین درس گاہوں کے سند یافتہ، خلیفۂ خاص خواجہ نظام الدین اولیاء کرتے تھے۔ کھانے کے برتن حسام الدین دھوتے۔ میزبانی فرید الدین مسعود کی ہوتی۔ ہر ایک کو کھلاتے، گو اکثر خود کچھ نہ کھاتے۔ انگور بہت پسند تھے لیکن نفس کشی کی وجہ سے کم ہی کھاتے۔ کبھی کبھی پان بھی کھا لیتے تھے۔

جماعت خانہ رات گئے تک کھلا رہتا اور اس روایت کی تقلید میں مزارِ مبارک آج بھی رات گئے تک کھلا رکھا جاتا ہے، تاہم جنہیں آنا ہوتا ہے، ان کے لیے دروازہ سال

کے ۳۶۵ دن اور دن کے ۲۴ گھنٹے کھلا رکھا جاتا ہے۔لوگ آتے جاتے رہتے۔ جو آتا جو ملتا وہ لیتا اور دعائیں لیتا اور دیتا چلا جاتا۔ یہ لین دین آج تک جاری ہے۔ جب خواجہ نظام الدین اولیاء اجودھن میں ہوتے تو رات کے کھانے کے بعد ان کی اور اپنے داماد بدر الدین اسحٰق دہلوی کی حجرے میں طلبی ہوتی۔ مسکرا کر پوچھتے ,,سناؤ مولانا نظام الدین! آج کیا ہوا اور کیا حال ہے؟'' جماعت خانے کے ہر فرد کا فرداً فرداً حال پوچھتے اور بتایا جاتا۔عشاء کی نماز باجماعت کے بعد، کٹیا میں کھٹیا بچھا دی جاتی۔ وہ کمبل جس پر بیٹھ کر، یا جسے اوڑھ کر، سارا دن گزارا تھا، اب اس کھاٹ پہ گدیلے یا توشک کا کام دیتا، تاہم کھاٹ کی پائنتی پر ایک چادر بچھانی پڑتی کیوں کہ کمبل اتنا چھوٹا تھا کہ پوری چارپائی نہیں ڈھانپ سکتا تھا۔ رات کو اگر چادر اوڑھ لیتے تو ضعیف اور مقدس پیروں کے نیچے کوئی بچھونا نہ ہوتا۔ ان کے مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے جو عصا عطا کیا تھا وہ سرہانے رکھتے اور اس پہ اپنا تکیہ رکھتے، جس پہ سر رکھنے سے پہلے کبھی عصا پر عقیدت سے ہاتھ پھیرتے تو کبھی اسے محبت سے بار بار چومتے۔ زندگی بھر اس تکیے پہ تکیہ رہا۔ اس پہ اپنا سفید، ضعیف، تھکا ماندہ سر رکھ کر اپنا محبوب مصرع گنگنانا شروع کر دیتے ع

میں تیرے لیے مرتا، تیرے لیے جیتا ہوں

اور پھر ہر رات کی طرح جیسے جیسے فضا میں سکوت طاری ہوتا جاتا، فرید الدین مسعود کی بے چینی بڑھتی جاتی۔ کبھی شعر پڑھتے ہوئے حجرے میں چہل قدمی، کبھی سوز و درد، کبھی پیچ و تاب، کبھی عصائے مرشد کے والہانہ بوسے، کبھی گریہ و زاری، کبھی سجدہ ریزی، کبھی وجد، کبھی پارے کی سی تڑپ اور کبھی رقص بسمل۔ ہر رات کی طرح یہ رات بھی بیت جاتی اور پھر ہر صبح کی طرح اجودھن کی مسجد سے فجر کی اذان بلند ہوتی ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ نماز نیند سے بہتر ہے۔'' امام وقت امامت کرتا اور پھر وہی حجرہ اور وہی دو گھڑی کا طویل سجدہ جس میں سب دوئیاں ختم ہو جاتیں اور تمام دوریاں سمٹ جاتی تھیں۔

فرید الدین مسعود نے زندگی بھر اچھے کپڑے نہیں پہنے۔ تاریخ کی گواہی موجود ہے

کہ لڑکپن میں جب کوتھے وال میں شیخ جلال الدین تبریزی سے ملے تو شلوار پھٹی ہوئی تھی۔ نوجوانی میں جب دہلی آئے اور مسجد سے باہر کسی نے نئے کپڑوں کا جوڑا پیش کیا، لے تو لیا، لیکن پہنتے ہی اتار دیا اور اپنے چھوٹے بھائی شیخ نجیب الدین متوکل کو یہ کہہ کر دے دیا کہ جو مزہ اپنے پھٹے پرانے کپڑوں میں ہے وہ بھلا ان میں کہاں؟ یہی ریت اجودھن میں رہی۔ اِدھر کسی نے کپڑوں کا نیا جوڑا دیا، اُدھر وہ کسی دوسرے ضرورت مند کے تن پہ نظر آیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ جو فقیر نیا جوڑا پہنتا ہے، وہ دراصل کفن پہنتا ہے۔ کپڑوں کا اثاثہ کل چار جوڑے تھے: ایک تن پہ، دوسرا دھلنے کے لیے، تیسرا ملاقاتیوں کے لیے اور چوتھا فوری ضرورت کے لیے۔

اپنی ساری زندگی ایک کچے حجرے میں اور اہل خانہ نے ایک کچے مکان میں گزار دی۔ ایک عقیدت مند نے لاکھ اصرار کیا کہ اپنے لیے نہ سہی، اپنے اہل خانہ کے لیے تو پکا مکان بنوانے کی اجازت دے دیں۔ فرمایا ''نہیں، یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ مسعود اپنی زندگی میں اینٹ پہ اینٹ نہیں رکھنے دے گا۔'' عقیدت مند نے اپنے دل کی حسرت فرید الدین مسعود کی زندگی کے بعد نکالی اور آپ کے مزار پر پکا اور خوب صورت گنبد بنانے کی سعادت حاصل کی۔

فرید الدین مسعود کو اپنے خالق سے عشق، اس کی مخلوق سے پیار اور دنیاوی دولت سے نفرت تھی۔ زندگی بھر طرح طرح کے تحائف پیش ہوتے رہے لیکن انہیں رات تک رکھنے کی اجازت نہ تھی کیوں کہ یہ توکل کے اس معیار کے خلاف تھا جو اجودھن کی یونیورسٹی کے نصاب تعلیم کا سب سے پہلا اور سب سے اہم سبق تھا۔ جب سلطانِ دہلی کی طرف سے غیاث الدین بلبن نے کہ ابھی اُلغ خان کہلاتا تھا، اشرفیوں کا توڑا اور چار گاؤں کی جاگیر کی سند عطیے کے طور پر پیش کیں، تو پوچھا ''یہ سب کیا ہے؟'' بلبن نے عرض کیا ''کچھ نقد رقم درویشوں کے لیے ہے اور چار گاؤں کے عطیے کی سند حضور کے لیے۔'' اجودھن کے شہنشاہ کے بارعب چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ بلبن کو غور سے دیکھا اور شکر جیسے میٹھے لہجے میں، ٹھہر ٹھہر کر دھیمی آواز میں کہا ''اُلغ خان! درویشوں کے لیے جو

کچھ لائے ہو، وہ تو میں رکھ لیتا ہوں اور ان میں تقسیم کردوں گا۔ رہی جاگیر کی سند، تو برا نہ مانو تو اسے لے جاؤ۔ اس کے لینے والے بہت پڑے ہیں، جسے چاہو دے دینا۔'' چند سوگزوں کے چند پلاٹوں پر اپنی خودی کو ملیا میٹ اور عزتِ نفس کو نچھاور کرنے والے جو آج بھی بہت سے ہوں گے، ان الفاظ پر غور کریں۔ اس کے بعد کس کی ہمت تھی کہ کچھ کہتا۔ بلبن نے سند بغل میں دبائی، ادب سے سلام کیا اور چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی اپنے داماد، خلیفہ اور خادم خاص مخدوم بدرالدین اسحٰق دہلوی کو جو حجرے کے دروازے کے باہر گوش بر آواز بیٹھے رہتے تھے کہ کب اندر سے بلاوا آئے اور فوراً برکتیں سمیٹنے پہنچ جائیں، طلب کیا اور حکم دیا کہ یہ سب اشرفیاں غرباء اور مستحقین میں فوراً تقسیم کردی جائیں۔ جھٹ پٹا ہو چلا تھا۔ اس زمانے کے اجودھن میں رات کو بجلی کے بلب اور ٹیوب لائٹیں تو جلنے سے رہیں۔ بہت ہوگا تو جماعت خانے میں مٹی کے ایک دو دیے سرسوں کے تیل سے جل رہے ہوں گے۔ ان ٹمٹماتے دیوں کی روشنی میں جب ساری اشرفیاں باہر لٹ گئیں تو بدرالدین اسحٰق دہلوی نچنت، نہال اور مالا مال ہو کر اندر آئے۔ دیا گھما کر دیکھا کہ کوئی اشرفی غلطی سے رہ تو نہیں گئی۔ ایک زمین پہ پڑی ملی، اٹھا کر ٹوپی میں رکھ لی کہ صبح کسی مستحق کو دے دیں گے۔ عشایئے کے بعد فریدالدین مسعود عشاء کی نماز پڑھانے آئے۔ تکبیر کہنی چاہی تو رک گئے، لگا کہ کسی نے دل پہ بوجھ سا رکھ دیا ہو۔ تین دفعہ تکبیر کے لیے ہاتھ اٹھائے اور تینوں دفعہ چھوڑ دیئے۔ نمازیوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ خدا خیر کرے، آج تک تو کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ پیچھے مڑے اور بدرالدین اسحٰق دہلوی سے پوچھا ''مولانا! وہ سب بانٹ دی تھیں نا؟'' وہاں کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، رکتے رکتے بمشکل کہا ''جی حضور! سوائے ایک کے جو اندھیرے میں زمین پر پڑی رہ گئی تھی۔'' فرمایا ''وہ کہاں ہے؟'' جواب دیا ''یہیں میری ٹوپی میں۔'' اور نکال کر پیش کی۔ فریدالدین مسعود نے اسے بہت احتیاط سے اٹھایا اور دروازے سے باہر پھینک دیا۔ نحیف و نزار ہاتھ اب آرام سے تکبیر کے لیے اٹھے اور خشوع و خضوع سے پوری نماز ختم کی۔ بعد میں دیر تک افسوس رہا کہ اس نہ چھونے والی چیز کو ہاتھ کیوں لگالیا؟

کچھ ایسا ہی ایک واقعہ، ایک دوسرے چہیتے خلیفہ خواجہ نظام الدین اولیاء بیان کرتے ہیں۔ یہ بیان ہو چکا ہے کہ وہ اس معزز جماعت خانے کے اعزازی باورچی تھے۔ ان کا کام ڈیلوں اور جنگلی پھولوں کو پانی اور نمک میں ابال کر اسے سالن کا نام دینا تھا۔ ایک دن جماعت خانے میں صرف اور صرف پانی تھا۔ پنساری کی دکان پاس تھی، اس سے تھوڑا سا نمک قرض کے طور پر لے آئے۔ رات جماعت خانے میں زمین پر دستر خوان بچھا کر عشائیہ چنا گیا۔ فرید الدین مسعود نے پہلا نوالہ اٹھاتے ہی واپس رکابی میں رکھ دیا۔ دھیمی سی آواز آئی ''مولانا نظام الدین! آج میرا ہاتھ کیوں بوجھل ہو گیا ہے؟'' خواجہ نظام الدین اولیاء نے ڈرتے ڈرتے کہا ''حضور! کھانا تو ہر روز کی طرح آپ کے خادم نے ہی پکایا ہے اور اس میں کوئی ایسی ویسی چیز نہیں ڈالی، البتہ حقیقت سے آپ ہی واقف ہیں۔'' پوچھا ''نمک کہاں سے آیا؟'' یہ سنتے ہی خواجہ نظام الدین اولیاء نے اپنا سر شیخ کے قدموں میں رکھ دیا اور ساری بات کہہ سنائی۔ حکم ہوا کہ سالن فوراً سامنے سے ہٹا دیا جائے۔ سالن ہٹ گیا تو فرمایا ''قرض اور توکل میں مشرق اور مغرب کا فاصلہ ہے، مولانا نظام الدین! درویش بھوکا سو جائے گا، سونا کیا مطلب، بھوکا مر جائے گا لیکن نفس کی خاطر قرض نہیں لے گا۔'' جماعت خانے کا پہلا درس یہ تھا کہ ہاتھ پھیلائیں تو صرف اللہ کے آگے۔ فرمایا کرتے تھے ''جب بندہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر اللہ کو پکارتا ہے تو اللہ کو حیا آتی ہے کہ ان ہاتھوں کو خالی واپس لوٹا دے۔''

جہاں یہ عالم ہو کہ اشرفی غلطی سے رہ جائے تو نماز سے یکسوئی ختم ہو جائے اور نمک کی چند ڈلیاں، مجبوری کے عالم میں، قرض کے طور پر آ جائیں تو لقمہ حلق میں اٹک جائے، اور استغنا ایسا ہو کہ ہر چیز شام ڈھلے سے پہلے بٹ جاتی ہو، اور جہاں نمک کے چند ڈلے بھی کسی سے ادھار لینے کی ممانعت ہو، تو یہ لازمی امر ہے کہ سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں کئی روز و شب ایسے بھی آئیں گے جب کھانے کو کچھ نہ ہوگا۔ ایسے دن آتے رہتے اور جیسے جیسے توکل بڑھتا گیا اور عمر گھٹتی گئی تو خصوصاً زندگی کے آخری برسوں میں جب عمر پچاسی (۸۵) برس سے اوپر ہو گئی تھی، اکثر ایسا ہوتا کہ نہ صرف

فرید الدین مسعود بلکہ ان کے پورے کنبے کے منہ میں بعض دن کھیل بھی اُڑ کر نہ جاتی۔ بیوی آئیں اور کہا "کچھ خبر بھی ہے؟ آپ کا چھوٹا بچہ دو دن سے بھوکا ہے اور مرنے والا ہے۔" فرمایا "بیوی! تقدیر الٰہی کے آگے بندۂ مسعود کیا کر سکتا ہے؟" خادمہ آئی اور کہا "آقا! آپ کی بیوی آپ کو صرف بچے کا بتا کر گئی ہیں، وہ خود بھی دو دن سے بھوکی ہیں۔" آپ خاموش رہے۔ خواجہ نظام الدین اولیاء آئے اور کہا "شیخ کبیر! آپ کے چہیتے مرید جمال الدین ہانسوی نے بتایا ہے کہ گزر بسر بہت مشکل سے ہو رہی ہے۔" اس بار خاموش نہ رہے۔ فرمایا "مولانا نظام الدین! ان سے جا کر کہہ دینا کہ مولانا جمال الدین! جب کسی کو ولایت عطا کی جاتی ہے تو اس کا بوجھ اٹھانا بھی ضروری ہوتا ہے۔" جماعت خانے کے مریدوں کا حال بھی اہل خانہ سے مختلف نہ تھا۔ خواجہ نظام الدین اولیاء کا قول پہلے ہی نقل ہو چکا ہے کہ جس رات ہمیں شیخ کے گھر پیٹ بھر کر ڈیلے کھانے کو مل جاتے، وہ ہمارے لیے عید کا دن ہوتا۔

اور یہ جماعت خانہ تھا کیا؟ گارے اور کچی اینٹوں سے بنا ایک بڑا سا کمرہ جس کی بنیاد کعبہ مشرفہ کی طرح نہایت بے سروسامانی کے عالم میں رکھی گئی اور جس میں نہ صرف برصغیر بلکہ باہر کے عظیم صوفیاء، علماء اور بزرگان با صفا اصحابِ صفّہ کی سی زندگی بسر کرتے۔ سر گھٹے ہوئے، تن پہ موٹے جھوٹے کپڑے، کچی زمین پہ ساتھ ساتھ بستر، ہاتھ میں کتابیں، دماغ میں اللہ کا تصور، دل میں اللہ کی یاد، زبان پہ اللہ کا نام اور منہ میں روزہ۔ راتیں اللہ کے ذکر میں کٹتیں۔ دن میں سب کے کام بٹے ہوتے۔ کوئی پانی بھرتا، کوئی برتن دھوتا، کوئی جنگل سے لکڑیاں لاتا، کوئی جنگلی پھل پھول اور پتے لاتا، کوئی انہیں ابال کر کبھی نمکین اور کبھی بلا نمک، کا سالن پکاتا۔ گندم کا آٹا مل جاتا تو اس کی روٹیاں پک جاتیں، نہ ملتا تو جوار کی موٹی موٹی روٹیوں پر ہی گزارا ہو جاتا، دستر خوان میسر ہوتا تو زمین پر بچھا کر یہ کھانا اس پہ چن دیا جاتا۔ نہ ہوتا تو زمین ہی دستر خوان کا کام دیتی۔ ہر ایک زمین پر بیٹھتا۔ ہر ایک کو برابر کا کھانا ملتا۔ تخصیص کھانے میں ہوتی نہ بٹھانے میں، نہ کسی اور چیز میں۔ سچ تو یہ ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی میں، اس پورے برصغیر میں، اگر زمین

کا کوئی ٹکڑا ایسا تھا جہاں شاہ اور گدا، امیر اور فقیر سب کا ایک جیسا استقبال اور سب سے ایک سا سلوک کیا جاتا تھا تو وہ پنجاب کے اس دور دراز قصبے اجودھن کے جماعت خانے اور اس کے اردگرد کی یہ چند سو مربع گز زمین تھی۔ جماعت خانے میں قرآن، حدیث، تصوف اور اسلامی قوانین کا گہرا مطالعہ ہوتا۔ اس مطالعے کا مقصد کسی ڈگری کا حصول تھا نہ کسی ملازمت کا، اس کا واحد مقصد اس شمع کے نور اور حرارت کو زیادہ سے زیادہ جذب کرنا تھا جس کے دم سے درویشی کے سلسلے کو رہتی دنیا تک روشن رہنا تھا۔ یہ جماعت خانہ اس دور کے برصغیر کی سب سے بڑی اسلامی، روحانی، اقامتی یونیورسٹی تھی جہاں تعلیم، تجربہ، تربیت، خوراک، رہائش سب مفت تھیں۔

فرید الدین مسعود مدھم آواز اور ملائم لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر، بعض اوقات دہرا دہرا کر، قرآن، حدیث، تصوف اور اسلامی قانون کے انتہائی پیچیدہ مسائل یوں سمجھاتے کہ یہ ابدال اور نابغہ ٔروزگار علماء جو یہاں طالب علم کی حیثیت سے مقیم تھے، عش عش کرا ٹھتے۔ ''اس کا کہا اللہ کا کہا تھا گو کہ وہ اللہ کے بندے کی زبان سے ادا ہو رہا تھا۔'' اور پھر تعلیم خالی زبان سے تو نہ تھی، سب سے بڑا معلم تو شیخ الجامعہ کا اپنا کردار تھا۔ شفاف آئینے کے مانند ایک ایسا کردار جس میں، عمر بھر، ظاہر اور باطن میں کبھی فرق نہیں رہا۔ کھرے سونے کی طرح ٹھوس، پائیدار اور اندر باہر سے یکساں چمکیلا، اور سب سے آخر میں اس تعلیم کا ذریعہ وہ باطنی توجہ تھی جو شیخ اپنے مریدوں پر کرتے رہتے۔ نظر نہ آنے والی برقی شعاعیں شیخ کی آنکھوں سے، اور مقناطیسی لہریں شیخ کے دل اور دماغ سے نکل کر مریدانِ باصفا کے قلب ونظر میں جذب ہو جاتیں اور تزکیہ نفس، تصفیہ قلب، تجلیہ روح اور تخلیے کے منازل طے کراتی، انہیں بے خودی سے خودی کے اس مقام پر لے آتیں جہاں انسان خود کو پہچان کر سیدھا خدا تک پہنچ جاتا ہے۔ خدا نے انہیں وہ چشم بینا عطا کی تھی کہ چہرے پہ سرسری نظر ڈالتے ہی دل کی تہ تک پہنچ جاتے اور بعض اوقات یہ کام سرسری نظر ڈالے بغیر بھی ہو جاتا۔ وہ ذہن رسا دیا تھا کہ مشکل ترین مسائل چٹکیوں میں حل اور آسان ترین پیرائے میں بیان کر دیتے۔ ان کی صحبت میں آدمی انسان بن جاتا جس کا بننا فرشتے سے

کہیں بہتر مگر کہیں مشکل تر ہے۔ دہلی کی اعلیٰ ترین درس گاہوں کے سند یافتہ جب اجودھن کے جماعت خانے کے کچے فرش پر بیٹھ کر، جس کی مٹی کی سوندھی مہک شیخ کی گفتگو کی بھینی خوشبو سے مل کر فضا کو ہر لمحے معطر کیے رہتی، فرید الدین مسعود کی زبان سے بڑے بڑے مسائل کا حل چھوٹے چھوٹے سادے جملوں میں سنتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ دریا کو کوزے میں بند کرنا کہتے کسے ہیں۔ آپ کا قول ہے کہ تدبیر میں نقصان اور تسلیم میں سلامتی ہے۔ آپ سے یہ قول بھی منسوب ہے کہ جو چڑیوں کو دانہ ڈالتا ہے، ایک دن ہما بھی اس کے دام میں پھنس جاتا ہے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ سات سو بزرگان دین سے چار سوال کیے گئے اور سب نے ایک سا جواب دیا۔ سوالات اور جوابات یہ تھے:

۱۔ سب سے عقل مند کون ہے؟ جو دنیا چھوڑ دے۔

۲۔ سب سے مال دار کون ہے؟ جو قانع ہے۔

۳۔ سب سے مفلس کون ہے؟ جو قانع نہیں ہے۔

۴۔ سب سے ولی صفت کون ہے؟ جو کسی سے متغیر نہ ہو۔

جب ان سوالوں کا مجسم جواب نظروں کے سامنے بیٹھا ہو اور اپنی میٹھی آواز میں، ٹھہر ٹھہر کر، یہ جوابات بتا رہا ہو تو کون ہے جس کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں ایک ایک جواب نقش دوام کی طرح ثبت نہ ہو جائے۔

اللہ گواہ ہے کہ اللہ ان کی آنکھ بن گیا تھا، ان کے کان بن گیا تھا، ان کی زبان بن گیا تھا، ان کے ہاتھ بن گیا تھا، ان کے پاؤں بن گیا تھا۔ وہ اگر اللہ کے ہو گئے تھے تو اللہ ان کا ہو گیا تھا، وہ اللہ سے راضی تھے اور اللہ ان سے راضی تھا۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

حق فرید یا فرید حق فرید بابا فرید

*****

جس طرح رسول کریم ﷺ کو ساری دنیا کے لیے اللہ کے پیغام کا پیغامبر بنا کر بھیجا گیا تھا، اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ کے نائبین کو، مختلف اوقات میں، مختلف علاقوں اور لوگوں کی طرف، تقلید سنتؐ کے لیے بھیجا جاتا رہا ہے۔ برصغیر میں صوفیائے عظام نے، ہر دور میں، ہر قسم کی مشکلوں، سختیوں اور مخالفتوں کے باوجود، اسلام کا پیغام یہاں کی مقامی آبادی تک پہنچانے کا جو کارنامہ سرانجام دیا ہے وہ کسی طرح جہادِ فی سبیل اللہ سے کم نہیں۔ ان صوفیائے کرام میں سلسلہ چشت کے بزرگانِ دین کو خاص مقام حاصل ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی نے اجمیر میں، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، خواجہ نظام الدین اولیاء اور نصیر الدین چراغِ دہلی نے دہلی میں ہزاروں غیر مسلموں کو مسلمان کیا۔ تاہم یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اجمیر، دہلی اور ان کے گرد ونواح میں آبادی کی اکثریت غیر مسلم ہی رہی، لیکن مغربی پنجاب میں اجودھن اور اس کے گرد ونواح میں فرید الدین مسعود کے ہاتھ پر ہندوؤں کے اتنے بڑے بڑے قبیلے یکے بعد دیگرے جوق در جوق اسلام لائے اور وہ مغربی پنجاب میں اتنی دور دور تک پھیلے کہ یہ علاقہ ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کی اکثریت کا خطہ ہوگیا۔ یہی عددی اکثریت سات سو برس بعد ۱۹۴۷ء میں، پاکستان کی واحد بنیاد بنی۔ اس طرح قیام مسعود اور قیام پاکستان میں باپ بیٹے والا تعلق ہے۔ وٹو قبیلہ جو آج بھی اوکاڑہ، ساہیوال اور پاک پتن کے اضلاع میں آباد ہے، نون اور ٹوانہ قبیلے جو سرگودھا میں آباد ہیں، یا سیال قبیلہ جو جھنگ اور کبیر والا میں آباد ہے، یہ سب فرید الدین مسعود کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ قرونِ اولیٰ میں اسلام کو پھیلانے کا جو اعزاز امیر المومنین عمر فاروقؓ کے نصیب میں آیا تھا، وہ ازمنہ وسطیٰ میں امیر المومنینؓ کی نسل میں پیدا ہونے والے اس درویش کو اس برصغیر میں عطا کیا گیا۔ کیا اب بھی اس بات میں کوئی شبہ ہوسکتا ہے کہ پاکستان کے حقیقی بانی فرید الدین مسعود ہیں؟

*****

ہندو مذہب میں بھجن کا ایک خاص مذہبی اور وجدانی مقام ہے اور اس کے ذریعے

ہندو مذہب کا پیغام اور اس کے اعتقادات گاؤں گاؤں، گلی گلی اور گھر گھر پہنچ جاتے تھے، اور پہنچ رہے ہیں۔ چشتی صوفیاء کو بھی ہندوستان میں اسلام کا پیغام اسی ہندو آبادی کے گھر گھر پہنچانا تھا۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے سماع سے خود بھی جی بھر کر حظ اٹھایا اور اسے اشاعتِ اسلام کے لیے بھی استعمال کیا۔ ایک مبصر کے الفاظ میں ''چشتیہ کے سماع کو جائز قرار دینے سے اس کی شرعی ممانعت کی شدت کا اثر کچھ کم ہوا تو ہندوستان کے موسیقاروں کا حوصلہ بڑھا۔ ان کے کئی گھرانے وجود میں آ گئے جن کے جذبہ مسابقت سے راگ میں ترقی کی رفتار تیز ہوئی اور ''خیال'' اور ''قوالی'' جیسے کئی اُسلوب موسیقی ایجاد اور مروّج ہوئے۔'' تاہم موجودہ قوالی اور اس دور کے سمع کا انداز دو بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ اس دور کے سماع میں قوالی کا سماں کچھ ایسا بندھتا ہوگا جیسے آج کل کے مشاعروں میں ترنم سے نعت پڑھنے کا ہوتا ہے۔ آلاتِ موسیقی ہوتے تھے نہ عامیانہ اشعار، نہ غیر سنجیدہ محفلیں۔ فلمی دُھنوں یا مغربی موسیقی کے طرز پر پڑھنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، کیوں کہ سات آٹھ سو برس پہلے فلمیں تھیں نہ مغربی موسیقی کا وجود۔ یہ ستار و سرود نہیں جذب و سرور کی محفلیں ہوتی تھیں۔ فرید الدین مسعود کے پیر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی بھی سماع کے رسیا تھے اور فرید الدین مسعود کے سب سے چہیتے مرید خواجہ نظام الدین اولیاء بھی۔ خواجہ نظام الدین اولیاء کی تمنا تھا کہ ان کی موت سماع کے دوران ہو۔ ان کی تو یہ خواہش پوری نہ ہوئی لیکن ان کی ولادت سے قبل ان کے دادا پیر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سماع کے اثر سے خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ یہ غیر مصدقہ روایت نہیں، حقیقت ہے کہ دہلی کی ایک خانقاہ میں محفل سماع ہو رہی تھی، قوالوں نے حضرت احمد جام کی غزل شروع کی اور جب اس شعر پر پہنچے ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

ترجمہ: ''تسلیم (ورضا) کے خنجر سے قتل ہونے والوں کو غیب سے ہر لمحے ایک نئی زندگی ملتی ہے۔'' تو قطب صاحب پر ایسا وجد طاری ہوا کہ بے ہوش ہو گئے۔ اسی حالت

میں اپنے مکان پر لائے گئے۔ جہاں ذرا سا ہوش آتا، شعر پھر پڑھنے کا حکم ہوتا۔ جب قوال پہلا مصرع "کشتگانِ خنجرِ تسلیم را" پڑھتے تو قطب صاحب بے جان ہوجاتے، اور جب دوسرا مصرع "ھر زماں از غیب جانے دیگر است" پڑھا جاتا تو معلوم ہوتا گویا نئی زندگی مل گئی ہے اور روح جسم میں واپس آ گئی ہے۔ نماز کا وقت آتا تو ہوش آ جاتا۔ نماز ادا کرتے ہی پھر وجد طاری ہوجاتا۔ تین دن اور تین راتیں یوں ہی تڑپتے رہے۔ چوتھی رات جب قوال پہلے مصرعے "کشتگانِ خنجرِ تسلیم را" کی تکرار کررہے تھے، آپ کی روح عالم وجد میں عالم بالا کی طرف رقصاں ہوگئی۔ یہ نومبر ۱۲۳۵ء تھا، ربیع الاول کی چودہ تاریخ اور سال ہجری ۶۳۳۔ نوے برس بعد، جب پچاسی (۸۵) سالہ خواجہ نظام الدین اولیاء نے ربیع الثانی کی اٹھارہویں کو ۷۲۵ھ میں انتقال کیا اور جنازے کے ساتھ جس میں تقریباً پوری دہلی شامل تھی، قوال ان اشعار پر پہنچے:۔

سرو سیمینا که تنها می روی
سخت بے مهری که بے ما می روی

اے تماشاگاہِ عالم روئے تو
تو کجا بھرِ تماشا می روی

ترجمہ: ''اے محبوب! تو تنہا جارہا ہے اور یہ کیسی بے مروتی ہے کہ ہمیں لیے بغیر جارہا ہے۔ تیرا چہرہ دیکھنے تو ایک دنیا آتی تھی، تو کسی کا جلوہ دیکھنے کہاں جارہا ہے؟'' تو کہا جاتا ہے کہ کچھ ایسا سماں بندھا کہ دہلی کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) شیخ الاسلام، شیخ رکن الدین ملتانی نے (جو فرید الدین مسعود کے ہم عصر شیخ بہاؤ الدین ذکریا کے پوتے تھے اور جن کا عظیم الشان مقبرہ جو سلطان محمد تغلق کا تعمیر کردہ اور فن تعمیر کا شاہکار ہے، ملتان کے تاریخی قلعے پر آج بھی موجود ہے۔) جو جنازے کے ساتھ چل رہے تھے اور جنہوں نے نمازِ جنازہ پڑھائی، سماع کو فوراً بند کرنے کا حکم دے دیا۔

فرید الدین مسعود کو بھی سماع سے بہت شغف تھا۔ سماع سے وجد میں آجاتے اور

جب وجد میں آتے تو رقص کرتے۔ اجودھن کے حاسد اور بنیاد پرست قاضی نے اسی کو بنیاد بنا کر ان کے خلاف ملتان کے علماء سے ان الفاظ میں فتویٰ مانگا: ''ایک عالم ایک مسجد میں رہتا ہے، گانا سنتا ہے اور ناچتا بھی ہے۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟'' علمائے ملتان نے نام اور مزید تفصیلات جانے بغیر فتویٰ دینے سے انکار کر دیا۔ جب نام بتایا گیا تو انہوں نے کہا ''معاذ اللہ! تم نے ایسے بزرگ کے بارے میں پوچھا ہے جن کے خلاف کوئی مجتہد تک انگلی نہیں اٹھا سکتا۔''

درویشی کی یہ شمع جو خود اندر ہی اندر جلتی لیکن اپنے اردگرد بیٹھنے والوں کو اندر کی روشنی عطا کرتی تھی، اکثر یہ دعا دیتی ''اللہ تمہیں سوز اور درد عطا کرے۔'' اللہ نے خود انہیں جو سوز اور درد عطا کیا تھا، سماع اس کے لیے محرک کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس درد کو اور چمکانے کے لیے کبھی وہ اپنے یہ دل پسند اشعار پڑھتے:

خواهم که همیشه در هوائے تو زِیم
خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم

مقصودِ منِ بنده زِ کونین توئی
از بهر تو میرم از برائے تو زیم

اور اس کے بعد کبھی اپنے حجرے میں چہل قدمی شروع کر دیتے تو کبھی رقص۔

ایک دفعہ نظامی کا یہ شعر سارا دن زبان پر رہا۔

نظامی ایں چه اسرار است کز خاطر عیاں کردی
کسے سِرّش نمے داند زباں درکش زباں درکش

ترجمہ: نظامی تو نے دل کا یہ راز کیوں ظاہر کر دیا؟ اس کا بھید تو کوئی نہ جانتا تھا۔ زباں بند رکھ، زباں بند رکھ۔

سارا دن گزر گیا لیکن شعر کا ورد جاری رہا۔ شام ہوگئی لیکن شعر کا ورد جاری رہا۔ افطار کا وقت آ گیا لیکن شعر کا ورد جاری رہا۔ ساری رات بیت گئی، سحری کا وقت آ گیا مگر

شعر کا ورد نہ تھا۔ جب بھی پڑھتے، ایک کیفیت طاری ہو جاتی۔

ایک دفعہ سماع کو جی چاہا۔ کوئی اور نہ تھا۔ اپنے داماد اور خلیفہ شیخ بدر الدین اسحٰق دہلوی سے کہا کہ ذرا قاضی محمد عطا حمید الدین ناگوری کا خط تو لے آؤ۔ خط آیا تو کہا ''پڑھو۔'' پہلا جملہ یہ تھا ''فقیر، حقیر، ضعیف، نحیف، محمد عطا کہ درویشوں کا غلام اور سر آنکھوں سے ان کے پاؤں کی خاک ہے۔'' اتنا سننا تھا کہ سوز اور درد کے گرما گرم چشمے ابل پڑے۔ محرک مل گیا تھا سو کیفیت طاری ہوگئی۔

ایک دفعہ جب کسی نے پوچھا کہ سماع جائز ہے یا نہیں، تو آپ کے منہ سے بے ساختہ نکلا: **سبحان اللہ یکے بسوخت وخاکستر شد، و دیگرے ہنوز دربحث است۔** ''یعنی ہم تو جل کر راکھ ہوگئے اور وہ ابھی بحث کر رہے ہیں کہ جائز ہے نا جائز۔'' اختصار، فصاحت اور طنز کا یہ حسین اور لطیف امتزاج اس نابغہ روزگار کی زبان سے ہی ادا ہوسکتا ہے۔

حق فرید یا فرید حق فرید بابا فرید

*****

فرید الدین مسعود کی تین بیٹیاں اور پانچ بیٹے تھے۔ آپ کو اپنے چوتھے بیٹے شیخ نظام الدین سے سب سے زیادہ محبت تھی۔ اسی طرح آپ کے بہت سے خلفاء تھے تاہم آپ کو خواجہ نظام الدین اولیاء سے جو اس وقت آپ کی خدمت میں اجودھن حاضر ہوئے جب ان کی عمر بیس برس کے لگ بھگ اور فرید الدین مسعود کی پچاسی (۸۵) برس کے قریب ہو چکی تھی، سب سے زیادہ محبت تھی۔ اپنے محبوب فرزند کو ''فرزند نانی'' اور محبوب مرید کو ''فرزند جانی'' کہتے تھے۔ ایک دفعہ اپنے بیٹوں اور چہیتے مریدوں کے ساتھ کشتی میں سفر کر رہے تھے۔ ''فرزند نانی'' اور ''فرزند جانی'' بھی ساتھ تھے۔ آپ نے معاً آواز دی ''نظام الدین!'' خواجہ نظام الدین اولیاء نے جو استقامت کے ساتھ ہر وقت مستعد رہتے تھے فوراً جواب دیا ''جی سرکار۔'' فرمایا ''میں نے تمہیں نہیں اپنے بیٹے کو بلایا تھا۔'' تھوڑی دیر بعد پھر آواز دی ''نظام الدین!'' خواجہ نظام الدین اولیاء پھر جھٹ سے بول

اٹھے ''جی حضور۔'' فرمایا'' سبحان اللہ! مسعود اپنے بیٹے کو برکت دینا چاہتا تھا لیکن اللہ یہ برکت کسی اور کو دینا چاہتا ہے۔''

وفات سے چند ماہ قبل فرید الدین مسعود نے دین اور دنیا کی ان برکتوں کا یہ پورا خزانہ ''فرزند جانی'' کو بخش دیا۔ چودہ شعبان کو حکم ہوا کہ آج رات نفلوں کی ادائیگی بھی باجماعت ہوگی اور امامت نوجوان مولانا نظام الدین کریں گے۔ یہ ایک لطیف اشارہ تھا کہ درویشی کی وہ شمع جو نوے برس سے خود جل رہی اور ایک عالم کو روشنی دے رہی تھی اب بظاہر گل ہونے والی ہے، اور چراغ سے چراغ جلانے کا وقت آن پہنچا ہے۔ اس بار عمر میں پہلی دفعہ رمضان کے فرض روزے چھٹ گئے۔ نوے برس کی عمر آخر کار اپنا طبعی اثر دکھا رہی تھی۔ عمر بھر کی شب بیداری، گریہ وزاری، پیہم ریاضت، درد وسوز، کم خوری اور کم زوری میں اب مستقل بیماری بھی شامل ہوگئی تھی۔ اس کے باوجود نمازوں میں فرض رکعتیں اب بھی کھڑے ہو کر پڑھتے، باقی بیٹھ کر۔ یہ اس روزے دار کی نوے سالہ صالح زندگی کا آخری ماہِ رمضان تھا۔ اس بار تراویح میں صرف سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص کی تلاوت کی گئی۔ تیرہویں تاریخ کو خواجہ نظام الدین اولیاء کی طلبی ہوئی۔ خلافت نامہ عطا ہوا۔ فرمایا کہ جو اِن کی تعظیم کرے گا اس پر اللہ رحم کرے گا۔ اس سے زیادہ کوئی بندہ کسی کے لیے اللہ سے کیا مانگ سکتا ہے؟

رمضان ختم ہوگیا۔ چہیتے مرید، خلیفہ خاص اور ''فرزند جانی'' کے ساتھ اجودھن میں عید منائی۔ اس جہانِ فانی میں شیخ فرید الدین مسعود اور خواجہ نظام الدین اولیاء کی یہ آخری مشترک عید تھی۔ اس کے بعد چہیتے مرید کو رخصت کی اجازت دی اور فرمایا ''مولانا نظام الدین! دین اور دنیا میں سے جو کچھ یہاں ہے وہ تمھیں عطا کر دیا گیا۔ اب دہلی جاؤ اور ہندوستان پر راج کرو۔'' سفر کے اخراجات کے لیے ایک اشرفی دی اور گلوگیر آواز میں فرمایا'' مجھے قرنوں پہلے کا وہ وقت یاد آ رہا ہے جب میں نے اپنے مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے آخری بار رخصت لی تھی۔ آپ نے اس وقت مجھ سے فرمایا تھا: بابا فرید! تم آج مجھ سے رخصت ہو رہے ہو اور میں جانتا ہوں کہ جب میں

دنیا سے رخصت ہوں گا تو تم میرے پاس نہ ہوگے۔ مولانا نظام الدین! آج تم مجھ سے رخصت ہورہے ہو اور میں جانتا ہوں کہ جب میں دنیا سے رخصت ہوں گا تو تم بھی میرے پاس نہ ہوگے، جیسے قطب صاحب کی وفات کے وقت میں ان کے پاس نہ تھا اور خواجہ معین الدین چشتی کی رحلت کے وقت قطب صاحب ان کے پاس نہ تھے۔''
خواجہ نظام الدین اولیاء کے دل پر جو گزری ہوگی وہ قلم بیان نہیں کرسکتا۔ قدموں میں گر پڑے اور روتے ہوئے کہا کہ میں تو ساری زندگی ان قدموں میں گزارنا چاہتا ہوں۔ فرمایا ''نہیں، تمہاری تربیت مکمل ہوچکی۔ تمہارے ذمے اب ایک کام ہے، اور تمہاری جگہ اجودھن نہیں، دہلی ہے۔'' خواجہ نظام الدین اولیاء زار و قطار روتے ہوئے جماعت خانے میں آئے۔ رخت سفر باندھا، چلنے والے ہی تھے کہ شیخ کے داماد، خلیفہ اور خادم خاص مخدوم بدرالدین اسحٰق دہلوی شیخ کا پیغام لے کر آئے ''شیخ کی خواہش ہے کہ ایک دن اور رک جاؤ۔ کل چلے جانا۔'' تاریخ ایک بار پھر خود کو دہرا رہی تھی۔ اب سے قرنوں پہلے جب فریدالدین مسعود نے، دہلی میں اپنے مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے آخری بار رخصت لے کر ہانسی جانے کے لیے رخت سفر باندھا تھا تو خواجہ صاحب نے بھی یہی کہا تھا ''بابا فرید! رک سکتے ہو تو ایک دن اور رک جاؤ، کل ہانسی چلے جانا۔''
شام ہوئی، افطار کا وقت آیا تو افطاری کے لیے جماعت خانے میں اللہ کا نام اور محمد ﷺ کا کلمہ تھا۔ خواجہ نظام الدین اولیاء نے عرض کیا ''زادِ راہ کے لیے جو اشرفی عطا ہوئی تھی اجازت ہو تو اس سے آج کی افطاری کا انتظام کرلیا جائے۔'' اجازت دے دی گئی اور ساتھ ساتھ یہ دعا بھی ''الٰھی! نظام الدین را محبوب گرداں۔'' ان دعاؤں کے سائے میں جن میں دین اور دنیا کی ہر نعمت عطا کردی گئی تھی، محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء اگلے روز اجودھن سے دہلی سدھارے، جہاں ہندوستان کی بادشاہت کب سے ان کی راہ تک رہی تھی۔

ذی قعد اور ذی الحج کے دو مہینے خیریت سے گزر گئے، اور پھر محرم کا مہینا آ گیا جس کی پہلی تاریخ کو، ساڑھے چھے سو برس پہلے، ان کے جدامجد امیر المومنین عمر فاروقؓ

کو شہادت نصیب ہوئی تھی اور جس کی دسویں تاریخ کو، چھ سو برس پہلے، اکتوبر کے تقریباً وسط میں، جگر گوشہ رسول کو کربلا کے میدان میں ذبح کیا گیا تھا۔ اس بار بھی اکتوبر کا وسط تھا۔ اجودھن میں راتیں ٹھنڈی اور دن معتدل ہو گئے تھے۔ روزے چھٹ چکے تھے لیکن ماں کی تربیت اور دعا کے طفیل نماز ایک وقت کی چھٹی، نہ قضا ہوئی۔ جماعت خانے کے ایک پرانے اور باصفا مرید سید محمد کرمانی دہلی سے اجودھن پہنچے۔ فرید الدین مسعود اپنے کچے حجرے میں، اپنی پرانی چار پائی پر، اپنا چھوٹا سا کمبل اوڑھے لیٹے تھے اور حجرے کے دروازے کے باہر آپ کے بیٹے اور مرید بیٹھے آپ کی جانشینی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ بیٹوں کے روکنے کے باوجود سید محمد کرمانی حجرے میں داخل ہوئے اور ضعیف پیروں کو ادب اور عقیدت سے چھولیا۔ فرید الدین مسعود نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں، سید محمد کرمانی کو پہچانا اور محبت سے پوچھا ''سید محمد! کیسے ہو؟ کب آئے؟'' شکر بار لہجے میں وہی جنم جنم کی مٹھاس گھلی ہوئی تھی، آواز گو مدھم ہو گئی تھی، لیکن بولنے کا انداز اب بھی وہی تھا، ٹھہر ٹھہر کر، جما جما کر۔ سید محمد نے جواب دیا ''حضور! آپ کی دعا سے بالکل ٹھیک ہوں۔ ابھی دہلی سے آیا ہوں اور سیدھا قدم بوسی کے لیے حاضر ہو گیا۔'' کم زور آواز میں کہا ''اللہ تمہیں خوش رکھے اور درد و سوز عطا کرے۔ اور ہاں تم تو دہلی سے آ رہے ہو، وہاں مولانا نظام الدین کیسے ہیں؟ ٹھیک تو ہیں نا۔'' اور پھر وہ سب ساز و سامان جو صوفیاء کی خلافت میں وہی مقام رکھتا ہے جو تاج اور تخت دنیاوی بادشاہت میں رکھتے ہیں...... یعنی اپنا جبہ، مصلیٰ اور عصا، سید محمد کرمانی کے حوالے کر کے اپنے ''فرزند جانی'' کو سونپنے کی ہدایت کی۔

آخری گھڑیاں نزدیک آنے لگیں تو بار بار ''فرزند جانی'' کے بارے میں پوچھتے ''نظام الدین کہاں ہیں؟ نظام الدین کہاں ہیں؟'' اور پھر کہتے ''وہ تو دہلی میں ہیں، ہاں میں بھی تو ہانسی میں تھا۔'' پھر اپنے ''فرزند نانی'' کے بارے میں پوچھتے ''نظام الدین کہاں ہے؟'' اور پھر کہتے ''وہ مجھ سے ملنے کے لیے روانہ تو ہو چکا ہے لیکن مل نہ سکا تو آنا کس کام کا؟'' یہ درست تھا کہ فرزند نظام الدین اجودھن کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ وہ

سلطان غیاث الدین بلبن کی فوج میں افسر تھے اور بدایوں کے قریب پٹیالی میں تعینات۔ والد کو خواب میں دیکھا تو فوراً اجودھن کے لیے چل پڑے۔

* * * * *

اور پھر پانچ محرم (مطابق پندرہ اکتوبر) آن پہنچی۔ تاریخ اسلام کا خوں چکاں مہینہ۔ شہادتِ عمرؓ اور شہادتِ حسینؓ کی تاریخوں کے درمیان کی تاریخ۔ رات سے بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے لیکن جب فجر کی نماز کا وقت آیا تو پوری طرح ہوش میں آگئے۔ نماز ادا کی، آخری صبح گزر گئی۔ ظہر کا وقت آیا، ظہر کی نماز پڑھی اور سائے ڈھلنے لگے۔ سہ پہر عصر کی نماز پڑھی اور سورج کی رنگت پیلی پڑنے لگی۔ پھر شام کو مغرب کی نماز ادا کی، یہ شام زندگی تھی۔ رات کے ساتھ ٹھنڈک بڑھتی جا رہی تھی۔ چھٹی کا چاند آسمان سے زمین کے چاند کو تک رہا تھا۔ حجرے میں سرسوں کے تیل کا دیا روشن تھا اور اس کی کم زور لو ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے لرز رہی تھی۔ زندگی کا دیا بھی ٹمٹما رہا تھا۔ غشی طاری تھی کہ مسجد سے عشاء کی اذان بلند ہوئی ''اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔'' یہ نام سننا تھا کہ غشی دور ہوگئی۔ ہوش میں آگئے، کہا ''عشاء کی نماز جماعت سے ادا کروں گا۔'' باجماعت نماز پڑھتے ہی پھر بے ہوش ہوگئے۔ گھڑی بھر بعد ہوش آیا۔ اردگرد نہ جانے کون کون کہاں کہاں سے آیا کھڑا تھا؟ نحیف و نزار جسم سے کم زور سی آواز آئی جس کی شیرینی میں کوئی کمی نہ آئی تھی ''میں نے عشاء کی نماز پڑھ لی ہے؟'' آسمان پر چمکتے ستاروں اور زمین پر ان کے گرد ہاتھ اور حلقہ باندھے پرستاروں نے گواہی دی ''حضور! پڑھ لی ہے۔'' فرمایا ''ایک بار پھر پڑھ لیتا ہوں، پھر خدا جانے کیا ہو؟'' دیے کی ملائم روشنی اور اجودھن کی ٹھنڈی ہواؤں میں، نوے سالہ فرید الدین مسعود نے جن کا سارا خون آخری عمر میں لاحق ہونے والی آنتوں کی موذی اور لاعلاج بیماری نے نچوڑ لیا تھا، جو صبح سے، پے در پے، بے ہوشی کے لمبے لمبے دورانیے کے دوروں کا شکار تھے، اور جن کا مرض الموت اب بالکل آخری مرحلے میں داخل ہو چکا تھا، عشاء کی نماز دوبارہ اپنے پیدا اور پرورش کرنے والے کے حضور میں ادا کی۔ دوسری بار نماز پڑھتے ہی پھر بے ہوش

ہو گئے۔ بیمار، بوڑھا اور کم زور جسم اب اور کتنا چلتا؟ اس بار بڑی دیر تک غشی طاری رہی۔ تنفس کا نظام بگڑ رہا تھا۔ عمر بھر کی بے چینی بھی اب اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی اور اجودھن کی یہ رات زیادہ ساکن اور گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ٹمٹماتے دیے کا تیل ختم ہو رہا تھا لیکن اس کی لو ابھی تک باہر سے آنے والی خنک ہوا کا مقابلہ کیے جا رہی تھی۔ شاید کسی کا انتظار تھا جو بہت دور سے منزلیں مارتا اجودھن کے قریب پہنچ چکا تھا۔ جب خاصی دیر بعد ہوش آیا تو اپنے اِردگرد دیکھا اور ڈوبتی ہوئی آواز میں، رک رک کر، کہا ''کیا میں نے...... عشاء کی نماز...... پڑھ لی ہے؟'' لوگوں کی ہچکیاں بندھ گئیں، کہا ''آقا! سرکار! ہمارے ماں باپ آپ پر قربان! اللہ ہماری عمر آپ کو لگائے، دو بار پڑھ چکے ہیں۔'' قدرت کی سرگوشیاں سننے والے نوے سالہ درویش نے سرگوشی میں فرمایا ''ایک بار پھر پڑھ لوں...... پھر خدا جانے کیا ہو؟'' پانچ محرم ۶۶۴ھ مطابق پندرہ اکتوبر ۱۲۶۵ء ''قاضی بچہ دیوانہ'' نے رات کے پچھلے پہر عشاء کی نماز، تیسری بار، پورے خشوع وخضوع سے اپنے مالک کے حضور ادا کی۔ اس کا گڑگڑا، گڑگڑا کر بار بار شکر ادا کیا اور تین بار اپنی مدھ بھری، ملائم، من موہنی، مدھم، میٹھی آواز میں، ٹھہر ٹھہر کر، جما جما کر، کہا:

يَاحَىُّ يَا قَيُّومُ، يَا حَىُّ يَا قَيُّوم، يَا حَىُّ يَاقَيُّومُ

بے شک وہ ہی ایک ذات ہے جو ہمیشہ سے زندہ اور سدا قائم رہنے والی ہے۔

حجرے کا دیا جو بہت دیر سے تیل کی کمی کی وجہ سے ٹمٹماتا اور سرد ہوا کے جھونکوں سے کپکپا رہا تھا، اچانک بھڑکا اور گل ہو گیا۔ اس کی پرانی روئی کی پتلی ملگجی بتی سے دھنویں کی ایک لمبی سیاہ لکیر بل کھاتی اُٹھی اور کائنات کی بسیط فضاؤں میں ہر سُو بکھر گئی۔ اب ہر سمت چاند کا نور تھا۔

...... فرید الدین مسعود خاموشی سے اپنے سفر کی اگلی منزل کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔

''میری آرزو ہے کہ جب تک جیوں تیری ہی دُھن میں جیوں، اور جب خاک ہو جاؤں تو تیرے قدموں میں زندہ ہو جاؤں، دونوں جہان میں مجھ بندے کا مقصود تو ہی

تو ہے، میں تیرے لیے مرتا اور تیرے ہی لیے جیتا ہوں۔"
ان کی آرزو اللہ نے ان کی زندگی میں بھی پوری کی، اور ان کے مرنے کے بعد بھی۔

حق فرید یا فرید حق فرید بابا فرید

* * * * *

"فرزندِ ثانی" شیخ نظام الدین اپنے والد کو خواب میں دیکھنے کے بعد، سیکڑوں میل دور، پٹیالی سے منزلیں مارتے اجودھن آرہے تھے۔ پٹیالی کا قصبہ ہندوستان کے سب سے بڑے صوبے اتر پردیش میں ہے اور خواجہ نظام الدین اولیاء کے مولد بدایوں کے قریب ہے۔ بیشتر روایات کے مطابق یہ قصبہ امیر خسرو کی جائے پیدائش ہے۔ (گو اَزمنہ ُوسطیٰ کی اکثر روایتوں کی طرح اس روایت کا بھی آج ثبوت فراہم نہیں کیا جاسکتا۔) جب اجودھن کی شہر پناہ کے قریب پہنچے تو رات ہوگئی۔ یہی وقت تھا جب فرید الدین مسعود انہیں بار بار پکار رہے تھے اور کہہ رہے تھے "وہ مل نہ سکا تو اس کا آنا کس کام کا؟" شہر پناہ کے محافظوں نے دروازے مقفل کر دیئے۔ شیخ نظام الدین نے محافظوں کی لاکھ منت سماجت کی لیکن انہوں نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ شہر پناہ کے اندر جاں بہ لب باپ، آدھی رات تک بے قراری سے، اپنے لاڈلے بیٹے کا انتظار کرتا رہا اور باہر بیٹا ساری رات بے چینی سے پو پھٹنے کا انتظار کرتا رہا۔ صبح ہوئی، دروازہ کھلا، شہر میں داخل ہوئے تو اجودھن کے ہر گھر سے رونے کی آواز آرہی تھی۔ ہونی شدنی ہوچکی تھی۔ وہ آفتابِ عالم تاب جو نوے برس پہلے کوٹھے وال میں طلوع ہوا تھا، آج اجودھن میں غروب ہوگیا تھا۔ نظام الدین یتیم ہوگئے تھے، اجودھن یتیم ہوگیا تھا اور ایک اجودھن پر ہی کیا موقوف، ایک عالم یتیم ہوگیا تھا۔ کلمہ گوؤں کا وہ سردار اُٹھ گیا تھا جس کا ثانی کبھی پیدا نہ ہوگا اور جس کا نام اس وقت تک تابندہ رہے گا جب تک ایک کلمہ گو بھی زندہ ہے۔
حجرے پر پہنچے۔ فرید الدین مسعود سے آج پہلی بار فجر کی نماز قضا ہوگئی تھی۔ وہ آج دن چڑھے تک حجرے میں اپنی پرانی چارپائی پر سو رہے تھے۔ اس پر وہی پرانا کمبل بچھا تھا

جس نے پائنتی تک نہ پہنچنے کی قسم کھائی تھی۔ جو دن کو ان کا اوڑھنا، رات کو ان کا بچھونا اور اجودھن میں ان کے بیس پچیس سالہ قیام کے دوران ان کی جلوتوں کا رفیق اور خلوتوں کا رازداں رہا تھا اور اس پہ وہی نحیف ونزار انسان سو رہا تھا۔ سفید بال، سفید داڑھی، سفید بھویں، سفید پلکیں، سفید اور نیلگوں ہونٹوں پر وہ لازوال مسکراہٹ جو سچے عاشق کو اپنے معشوق سے ملنے پر ہوتی ہے۔ لگتا تھا یہ ہونٹ ابھی کسی نازک کلی کی طرح آہستہ سے کھلیں گے اور وہ میٹھی اور دھیمی آواز جو بیس پچیس برس اس حجرے کی کچی دیواروں میں، اللہ کی آواز بن کر، گونجتی رہی تھی، ایک ایک لفظ جما جما کر ادا کرے گی: ''میرے لاڈلے بچے! میرے نظام الدین! میری جان! تو نے بڈھے باپ کو بہت انتظار کرایا، اب تیرا آنا کس کام کا؟'' جھریوں بھرا، بارعب، نورانی چہرہ جو آنتوں کی لمبی اور تکلیف دہ بیماری سے آخری دنوں میں خاصا پیلا پڑ گیا تھا، اب بالکل زرد تھا لیکن اس پہ سکون کا رنگ اور چوکھا ہو گیا تھا۔ آج دل میں جوار تھا نہ بھاٹا۔ نفسِ مُطمئنہ کو آخر قرار آ ہی گیا تھا۔ وہ مر کے اَمر ہو گئے تھے۔ ایک کونے میں وہ کلونس کھایا دیا خاموش پڑا تھا جو رات کے پچھلے پہر، تیل ختم ہو جانے کے بعد، خنک ہوا کے تابڑ توڑ تھپیڑوں سے بھڑک کر گل ہو گیا تھا۔ اسی حجرے میں وہ ہر صبح دو دو گھنٹے سجدے میں پڑے، ماتھا رگڑ رگڑ کر، اپنے محبوب کے آگے بلک بلک کر رویا کرتے تھے۔ یہیں وہ کبھی سخت بے قراری اور کبھی عالمِ سرمستی میں ہاتھ پیچھے باندھے، چہل قدمی کرتے ہوئے، مَدھُر سروں میں، گنگنایا کرتے تھے: ''میں تیرے لیے مرتا اور تیرے لیے جیتا ہوں۔'' یہیں وہ وجد میں آ کر رقص کیا کرتے تھے۔ انہی در و دیوار میں وہ سرمدی آواز گونجی تھی جس کی صدائے بازگشت ساڑھے سات سو برس سے مسلسل گونج رہی ہے ''مجھے چھری نہیں سوئی دو، کہ میں کاٹتا نہیں، سیتا ہوں۔'' یہیں دُنیاوی بادشاہت مانگنے والے کو دہلی کی سلطنت اور استقامت چاہنے والے کو رہتی دُنیا تک دین اور دُنیا کی بادشاہت عطا کی گئی تھی۔ اس ایک بوڑھے شخص کی وجہ سے یہ دُنیا کتنی جوان لگتی تھی؟ یہ چھوٹا سا کمرہ کتنا بھرا بھرا لگتا تھا؟ یہ ریتیلا قصبہ کتنا ہرا بھرا لگتا تھا؟ یہاں کی ہر چیز کتنی خوب صورت لگتی تھی؟ آج سب

کچھ وہی تھا اور وہیں تھا، نہیں تھا تو صرف ایک شخص نہیں تھا۔ صرف ایک شخص، اور ہر چیز جیسے خالی ہوگئی تھی، ویران ہوگئی تھی، جیسے ہوتے ہوئے بھی نہیں رہی تھی...... صرف اس لیے کہ وہ ایک شخص نہیں رہا تھا جس کے دم سے یہ سب کچھ تھا۔ انہوں نے نوے برس جس انتظار میں گزارے وہ اب ختم ہوگیا تھا۔ وہ آج اپنے معشوق سے وصل کے لیے وصال کر گئے تھے۔ شہ باز سدرۃُ المنتھیٰ سے پرے پرواز کر گیا تھا۔ ''میری آروز ہے کہ جب تک جیوں تیری ہی دُھن میں جیوں اور جب خاک ہوجاؤں تو تیرے قدموں میں زندہ ہوجاؤں۔ دونوں جہاں میں مجھ بندے کا مقصود تو ہی تو ہے، میں تیرے لیے مرتا اور تیرے ہی لیے جیتا ہوں۔''

حق فرید یا فرید   حق فرید بابا فرید

*****

اب کفنانے دفنانے کا مرحلہ آیا۔ جس حجرے میں بلبن ہاتھ باندھے، تیمور ننگے سر اور جس کی دہلیز تک اکبر ننگے پاؤں پیدل چل کر حاضر ہوا تھا، وہاں کفن تھا، نہ لحد کے لیے اینٹیں۔ کفن کا مسئلہ ایک مرید کی بیوی نے ایک پاک، صاف، سفید چادر دے کر حل کر دیا اور قبر کی اینٹوں کے لیے ان کے چھوٹے سے حجرے کا دروازہ توڑ کر دیوار سے کچھ کچی اینٹیں نکال لی گئیں اور ان کا پاک جسم، ان کے حجرے کے نزدیک، ایک لحد میں امانت کے طور پر رکھ دیا گیا، جہاں اس مضمون کی ایک تختی لگی ہوئی ہے:

اولیں آرام گاہ	
سیّدنا زہد الانبیاء	بابا فریدالدین مسعود گنج شکر
حضرت	رحمتہ اللہ علیہ

نوے برس پہلے آسمان نے زمین کو جو امانت سونپی تھی آج زمین نے بہ صد احترام آسمان کو لوٹا دی۔ خاک کو امانتہً خاک کے سپرد کر دیا گیا۔

حق فرید یا فرید   حق فرید بابا فرید

✲✲✲✲✲

خواجہ نظام الدین اولیاء کو جب دہلی میں خبر ملی کہ اجودھن میں کیا سانحہ پیش آچکا ہے تو ان پر قیامت گزر گئی۔ نوے سالہ فرید الدین مسعود محبوبِ الٰہی کے صرف پیر و مرشد ہی نہیں، ان کے محبّ اور محبوب بھی تھے۔ ان کی ہر ہر بات خواجہ نظام الدین اولیاء کو یاد آ رہی تھی۔ بدایوں میں، بارہ برس کی عمر میں، ابوبکر قوال کی زبان سے پہلی بار ان کا ذکر سننا، اس کے بعد برسوں تک ہر نماز کے بعد دس بار ''یا شیخ فرید الدین'' اور دس بار ''یا مولانا فرید الدین'' کا وِرد، پاک پتن میں پچاسی سالہ شیخ سے بیس سالہ نظام الدین کی پہلی ملاقات اور شیخ کا وہ مشہورِ زمانہ شعر پڑھنا ؎

اے آتشِ فراقت دلہا کباب کردہ
سیلابِ اشتیاقت جانہا خراب کردہ

ترجمہ: ''جدائی کی آگ نے دلوں کو راکھ کر دیا اور شوق کے سیلاب نے جانوں کو خراب کر دیا۔'' وہ مشہورِ عالم دُعا جس میں ''فرزندِ جانی'' کے لیے یہ کہہ کر سب کچھ مانگ لیا گیا تھا: ''**الٰھی ! نظام الدین را محبوب گرداں**'' اور آخر میں وہ آخری ملاقات اور اس میں وہ واشگاف اعلان: ''مولانا نظام الدین ! دین اور دُنیا میں سے جو کچھ یہاں ہے وہ تمہیں عطا کر دیا گیا۔ اب دہلی جاؤ اور ہندوستان پر راج کرو۔'' اور پھر درد میں تڑپتے اور سوز سے دہکتے وہ الفاظ: ''میں جانتا ہوں کہ جب میں اس دُنیا سے رخصت ہوں گا تو تم میرے پاس نہ ہو گے۔'' اور پھر روانگی کے وقت شیخ بدر الدین اسحٰق دِہلوی کا پیغام لے کر آنا: ''شیخ کی خواہش ہے کہ ایک دن اور رک جاؤ، کل چلے جانا۔'' فقر و فاقہ کے باوجود اپنی آخری پونجی سفر کے اخراجات کے لیے عطا کرنا۔ جماعت خانے کا آخری افطار جو اس آخری اشرفی سے پورا ہوا۔ جانے والے کی کون کون سی باتیں یاد کرتے۔ اس کے لیے تو ساری عمر پڑی تھی جو کافی نہ تھی۔ افتاں و خیزاں دہلی سے اجودھن کی طرف چل پڑے۔

اجودھن پہنچے تو مرشد کا جسدِ پاک اس لحد سے، بہ صد احترام و محبت، نکال کر جہاں اسے امانتہً خاک کے سپرد کیا گیا تھا، زمین کے اس ٹکڑے کو سونپا جو قسامِ ازل کی طرف سے زندگی میں ان کی قیام گاہ کے لیے مختص اور بعد میں ان کی خواب گاہ کے لیے مقدر کیا گیا تھا۔ اپنی نگرانی میں رَوضہ تعمیر کرایا۔ روایت ہے کہ رَوضے کی تعمیر یوں کی گئی کہ دریائے ستلج کے کنارے سے رَوضے تک تین (۳۰) حفاظِ قرآن ایک قطار میں کھڑے ہوتے تھے۔ اینٹیں دریا کے کنارے لائی جاتیں۔ ہر اینٹ دھوئی جاتی، پھر اسے پہلے حافظ کے حوالے کر دیا جاتا جو اس پر پہلا سپارہ پڑھ کر دم کرتا۔ دوسرا حافظ دوسرا سپارہ پڑھ کر دم کرتا اور اس طرح یہ اینٹیں یکے بعد دیگرے آخری اور تیسویں حافظ تک پہنچتیں اور پھر انہیں رَوضے کی تعمیر میں استعمال کیا جاتا۔ روضے کے دو دروازے رکھے گئے۔ ایک مشرق کی جانب جہاں سے سورج طلوع ہوتے ہی ان کے رَوضے کی زیارت کرتا ہے، یہ دروازہ سات صدیوں سے رَوضے میں اندر جانے اور باہر آنے کا اکلوتا راستہ ہے، اور ان کے جماعت خانے کے مہمان نواز دروازے کی طرح آج بھی صبح سے رات گئے تک ہر آنے والے کے لیے کھلا رہتا ہے۔ اور دوسرا ان کی پائنتی یعنی جنوب کی جانب جو محرم کی پانچ راتوں کے سوا پورے برس بند رہتا ہے۔ شیخ کا وہ مرید جو ان کی زندگی میں انہیں پکا مکان بنوانے پر راضی نہ کر سکا تھا، اس نے اب ان کے مزار پر قبہ بنوا کر اپنے عمر بھر کے ارمان، جی بھر کے نکالے۔

روایت ہے جو صدیوں سے انسانوں کے دلوں میں اسی طرح سے بہتی چلی آ رہی ہے جیسے پنجاب کے دریاؤں کا پانی کہ رَوضے کی تعمیر کے بعد نوجوان خواجہ نظام الدین اولیاء اس کی پائنتی کے دروازے یعنی جنوبی دروازے کے باہر کھڑے تھے کہ اچانک ان پہ وجد طاری ہو گیا اور انہوں نے بے خودی کے عالم میں تالیاں بجا کر کہا ''لو دیکھ رہے ہو، رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ مَن دَخَلَ هٰذَا البَابَ اٰمِنَ یعنی جو اس دروازے میں داخل ہوا، امن پا گیا۔ کلام اللہ کی تیسری سورۃ آلِ عمران کی ۹۷ ویں آیت میں کعبۂ مشرفہ کے بارے میں فرمانِ خداوندی ہے: وَمَن دَخَلَه كَانَ

امناً یعنی جو اس میں داخل ہوا، امن پا گیا۔ کلام اللہ اور کلامِ رسول اللہ ﷺ کے الفاظ اور معانی دونوں کی مماثلت قابل غور ہے۔ ''بے شک اس کا کہا اللہ کا کہا تھا اگرچہ وہ اللہ کے بندے کی زبان سے نکل رہا تھا۔''

اس روایت کی بنا پر، جس کا ذکر خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات میں نہیں ملتا، صدہا برس سے کروڑہا انسانوں کا یہ پختہ اعتقاد رہا ہے کہ اس دروازے میں سے ایک بار گزر جانے والا جنت میں جگہ پائے گا۔ اس دروازے سے صرف چند گز پرے، مشرق کی جانب ایک پکا اور اونچا چبوترہ رَوضے کی دیوار سے متصل بنا ہوا ہے، جس کے بارے میں روایت چلی آرہی ہے کہ خواجہ نظام الدین اولیاء نے رسولِ کریم ﷺ کو، صحابہؓ کرام کے ساتھ، اس جگہ کھڑے دیکھا تھا۔ چبوترہ بنانے کا مقصد غالباً اس جگہ کو لوگوں کے قدموں کے نیچے آنے سے محفوظ رکھنا تھا۔

ذہن میں قدرتی طور پر سوال ابھرتا ہے کہ کوئی شخص کسی دروازے میں صرف داخل ہو کر کیسے امن پا سکتا ہے؟ اس کا ایک فوری جواب تو یہ ہے کہ ایک عام دروازے میں دھکم پیل کر کے داخل ہونے اور اللہ کے دوست کی خواب گاہ کے دروازے میں عقیدت کا جذبہ اور شفاعت کی امید دل میں لیے وارفتگی سے داخل ہونے میں زمین آسمان کا فرق ہے اور دوسرا مسکت جواب یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ میں معانی کے سمندر موج زن ہوتے ہیں۔ گفتہ ٔ او گفتہ ٔ اللہ بود کا اِطلاق یہاں سے زیادہ بھلا کہاں ہو سکتا ہے؟ ان الفاظ کے ایک معانی تو وہ ہیں جو ہر کس و ناکس کو پانی کی سطح پر پنکھڑیوں کی طرح تیرتے نظر آتے ہیں تاکہ ایک معمولی فہم کا آدمی بھی انہیں آسانی سے سمجھ سکے لیکن ایک معانی وہ ہیں جو سطح آب کے نیچے تہ در تہ آراستہ ہوتے ہیں، یا انسانی آنکھ کی پہنچ سے دور پَرا جمائے صف بستہ ہوتے ہیں اور ان دماغوں پر روشن ہوتے ہیں جو عقل کی دوربین اور علم کی خوردبین سے اس سمندر کی لمبائی، چوڑائی اور گہرائی کا تعین کرتے ہیں، مگر جیسے کسی دوربین سے کبھی سمندر کا آخری سرا نظر آیا ہے نہ کسی خوردبین سے سمندر کی پوری تہ نظر آئی ہے، اسی طرح اصل معانی ان سینوں پر کھلتے ہیں جن پر یہ کھولے

جانے مقدر ہوتے ہیں۔ اور جنہیں علم اور عقل کے ساتھ عشق کی بے بہا دولت سے بھی مالا مال کیا جاتا ہے۔ حدیثِ رسول ﷺ کی پوری گہرائی اور گیرائی پر تدبر کیے بغیر، لفظی ترجمے سے ہٹ کر، بابِ جنت میں داخل ہونے کا ایک واضح مطلب "صاحبِ بابِ جنت" کے سائے میں آنا ہوسکتا ہے جس کی علامت (Symbol) یہ دروازہ ہے، اور جو خوش نصیب جیتے جی اس کے سائے میں آ گیا وہ اللہ اور اللہ کے حبیب ﷺ کے سائے میں آ گیا اور جنت کے دروازے اس پر نہیں کھلیں گے تو کس پر کھلیں گے؟

تاہم اگر لفظی ترجمے پر ہی جائیں تو کیا ہمارا یہ ایمان نہیں کہ ایک کافر محض اپنی زبان سے کلمہ طیبہ پڑھ کر اسلام کے دائرے میں داخل ہوجاتا ہے اور اللہ کی رحمت سے اس پر بالآخر دوزخ کے دروازے بند اور جنت کے دروازے وا کر دیئے جائیں گے؟ اور کیا ہمارا یہ اعتقاد نہیں کہ اگر ایک گناہ گار مسلمان مرنے سے پہلے اپنے گناہوں سے توبہ کرلے تو وہ امید رکھ سکتا ہے کہ اللہ کی رحمت کے دروازے اس پر کھول دیئے جائیں گے؟ کون جانتا ہے کہ جنت کیا ہے اور اس میں جگہ کیسے ملے گی، کسے ملے گی اور کیوں ملے گی؟ اور کون یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ اگلے جہاں میں جنت کی لذت صرف انہیں کے حصے میں آئے گی جو اس جہاں میں گناہ کی لذت سے محروم رہیں گے؟ جنت کے دعوے دار یہ نہ بھولیں کہ جنت جو بھی ہے اور اس میں جو بھی جائے گا وہ اپنی عبادت کے بل بوتے پر نہیں بلکہ رحمتِ خداوندی کے صدقے سے جائے گا اور دوزخ کے طبل بردار یہ نہ بھولیں کہ رحمتِ خداوندی اپنے بندوں کو معاف کرنے کے بہانے ڈھونڈتی ہے ۔

رحمتِ حق بہانہ می جوید

رحمتِ حق بہا، نہ می جوید

وہ مسبّب الاسباب جو ہمیں ماں باپ سے ستر گنا زیادہ چاہتا ہے، اس کے کام کرنے کا اپنا ایک انداز ہے اور اس کے لیے وہ ایسے ایسے اسباب پیدا کرتا رہتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس کا حکم ہو تو کسی دروازے میں داخل ہونا تو بڑی بات ہے، اس سے بھی کوئی معمولی چیز انسان کو جنت میں جگہ دلا سکتی ہے۔ اس کے فضل کی کوئی حد

ہے نہ حساب۔ یہ کس پہ ہوتا ہے؟ کیوں ہوتا ہے؟ کب ہوتا ہے؟ کتنا ہوتا ہے؟ کیسے ہوتا ہے؟ کیسے بتایا جاتا ہے؟ کیسے سمجھایا جاتا ہے؟ یہ خود ایک راز ہے اور سینہ کائنات کے ہر سربستہ راز کی طرح کبھی کسی دانائے راز پہ آشکارا ہوتا ہے تو کبھی کسی عاصی یا عامی پر ''بابِ جنت'' کی طرح وَا کر دیا جاتا ہے۔

محرم کی پانچویں تاریخ بعد نمازِ عشاء جب بابِ جنت کھلتا ہے اور خواجہ نظام الدین اولیاء سے منسوب اس عظیم الشان روایت کی یاد تازہ کرنے کے لیے عشق سے چور، عقیدت سے سرشار لاکھوں زائرین، خواجہ صاحب کی تقلید میں، بھرپور جذبے اور والہانہ انداز میں، اپنے دونوں ہاتھوں سے ایک ساتھ دو تین منٹ تک تالیاں بجاتے ہیں تو پورا پاک پتن گونج اُٹھتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ زمین و آسمان گونج اُٹھتے ہیں۔ اس روایت کی اصل کیا ہے؟ یہ اللہ جانے، اللہ کا حبیب ﷺ جانے اور اللہ کا محبوب جانے۔ ہم جیسے عاصی اور عامی تو تاریخ کے حوالے سے صرف اتنا جانتے ہیں کہ اس روایت کے بعد سے، اس پونے چھ فٹ اونچے اور ڈھائی فٹ چوڑے بظاہر عام سے دروازے کے بھاگ جاگ اُٹھے اور اسے وہ تقدس ملا جو آج تک دُنیا کے کسی اور دروازے کو، دروازے کے طور پر، نصیب نہ ہوا۔ سات صدیاں بیت چکی ہیں۔ ہر برس لاکھوں انسان اس میں سے صرف ایک سیکنڈ کے لیے، محض ایک بار، گزرنے کی آرزو میں بے قرار رہتے ہیں۔ ان کی اس بے قراری کو کیسے قرار آتا ہے اور اسے کون قرار دیتا ہے؟ وہ وہاں کیا ڈھونڈتے اور کیا پاتے ہیں؟ یہ اللہ اور اس کے بندے کے معاملات ہیں۔

فرید الدین مسعود کے لیے ندا آئی تھی: ''یہ وحید عصر ہوگا۔'' ان کے لیے کہلوایا گیا تھا: ''وہ ایک شمع ہے جس سے درویشی کا سلسلہ سدا روشن رہے گا۔'' یہ شمع اگر آج اس لیے روشن تر نہیں کہ اسے روشن کرنے والا اسے پہلے ہی روشن ترین کر چکا تھا، تو ویسی ہی روشن ضرور ہے جیسی اب سے سات صدیاں پہلے تھی۔

زندگی میں ان کا دستور رہا کہ جو حاجت مند ان تک پہنچ جاتا، اسے پیار سے اپنے پاس بلاتے، بٹھاتے، اس کی بات توجہ سے سنتے اور اس کی ضرورت دردمندی سے پوری

کرتے، سائل کو کبھی نہ جھڑکتے اور خالی ہاتھ آنے والے کو کبھی خالی ہاتھ واپس نہ جانے دیتے۔ سخی کا ہاتھ آج بھی ویسے ہی کھلا ہے۔ اس کے دَر کی رِیت اور دربار کی روایت میں آج بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ جو بھی خلوص اور محبت سے ایک بار ان کے دربار میں پہنچ جاتا ہے اور سوز و درد سے اپنے بابا کے دَر کی کنڈی کھٹکھٹاتا ہے، اللہ اپنی سنت، اس دروازے کی رِیت اور مانگنے والے کے ظرف اور استطاعت کے مطابق اس کی جھولی ایسی بھر دیتا ہے کہ مانگنے والے سے سنبھالے نہیں سنبھلتا، کیوں کہ داتا وہی ایک ہے، اس کے سوا کوئی نہیں، اور وہ اپنے محبوب ترین بندے ﷺ کے ذریعے یہ کہلوا چکا ہے کہ بندہ عبادت کے ذریعے مجھ سے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اسے دوست بنالیتا ہوں اور جب میں اسے دوست بنالیتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔

......اور فرید الدین مسعود نے کہا تھا کہ چالیس برس مسعود نے وہی کیا جو اللہ نے چاہا، اب جو مسعود چاہتا ہے وہ کر دیا جاتا ہے۔

هرگز نمیرد آں که دِلش زنده شد بعشق
ثبت اَست بر جریدهٔ عالم دوامِ ما

اگست کے پھول

نو اگست ۱۹۹۰ء کو لاہور میں انار کلی سے گزر رہا تھا۔ خیال آیا کہ ہندوستان کا پہلا مسلمان بادشاہ قطب الدین ایبک یہیں مدفون ہے۔ ایک صاحب ساتھ تھے جنہیں جگہ معلوم تھی۔ ان کے ساتھ وہاں پہنچا۔ ایک پختہ احاطہ تھا جس میں چند بچے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ اس احاطے کے وسط میں ایک چھوٹا سا نوتعمیر مقبرہ تھا جو ایک اجنبی سیاح کی طرح، جس کا پاسپورٹ گم ہوگیا ہو، گم سم اور حیران و پریشان کھڑا تھا۔ یہاں اُداسی کا زیادہ احساس تو نہ تھا، لیکن بے اعتنائی اور تنہائی کا تھا۔ دو قدم دور، لاہور کے مصروف ترین بازار انار کلی میں، رنگوں، روشنیوں، آوازوں اور انسانوں کا سیلاب رواں دواں تھا۔

اور پھر چند روز بعد ہی، تاریخ کا قرض اور بھول بھلیاں مجھے لاہور سے دِلّی کے علاقے مہرولی کے ایک ایسے کھنڈر میں لے آئے جس کی چھت خدا جانے کب کی گر چکی تھی۔ کلونس کھائی موٹی موٹی دیواروں کی شکست و ریخت صدیوں کی بے پروائی کی شاکی اور شاہد تھی۔ کوئی کتبہ تھا، نہ کوئی بورڈ۔ ہر سو ایک ویرانی ہی ویرانی تھی، نزدیک ہی ایک خوب صورت مسجد اور ملحقہ مزار تھے جن کی رعنائی سے کھنچ کر میں سڑک پر موٹر رکوا کر، کئی سو گز کا فاصلہ طے کر کے، کودتا پھاندتا یہاں پہنچا تھا۔ مسجد میں موجود، ایک صاحب سے اس بے نام کھنڈر کے بارے میں پوچھا۔ بولے ”میاں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا، سنا یہ ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن کا مقبرہ ہے۔“ میرا ذہن اپنی چھٹی جماعت کی تاریخ کی کتاب کی طرف لوٹ گیا۔ آج وہ تاریخ نظر کے سامنے تھی۔ بعض (انتہائی ضعیف) روایات کے مطابق، سلطان بلبن کی ایک بیٹی ہزیرہ بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی بیوی تھیں۔ تاہم سلطان کے بابا صاحب کے حلقہ ارادت میں داخل ہونے پر سب کا اتفاق
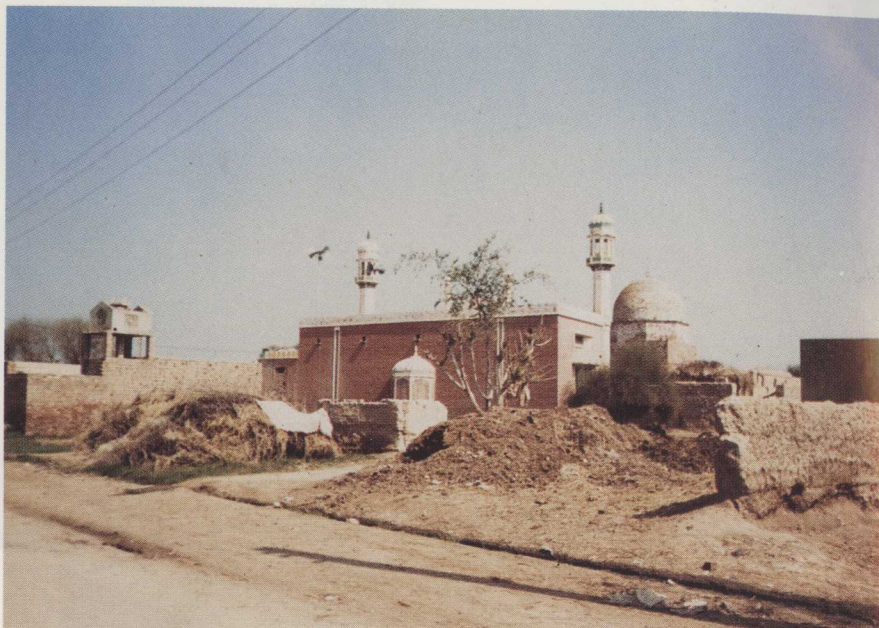
ملتان سے دس میل دور کوٹھے وال نامی قصبہ ہے۔ اس کی مسجد کے عقب میں فرید الدین مسعود کے والد سے منسوب ایک نو تعمیر مقبرہ ہے۔
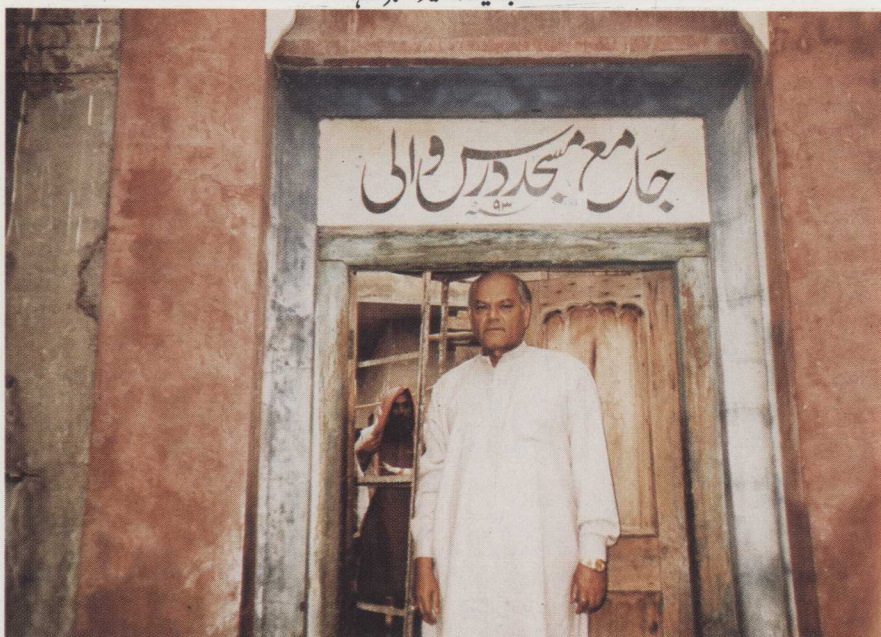
ملتان کے تاریخی قلعے کے دامن میں، "جامع مسجد درس والی" کے نام سے ایک مسجد ہے جس کے دروازے پر اس کا سال تعمیر ۹۳ھ رقم ہے۔

ضلع بھاولپور کے شہر اوچ میں واقع وہ کنواں جس کے بارے میں روایت ہے کہ فرید الدین مسعود نے اس میں چلہ کھینچا تھا۔ دائیں طرف کنویں کا منہ اور بائیں طرف ""مسجد حاجات"" کا دروازہ ہے۔
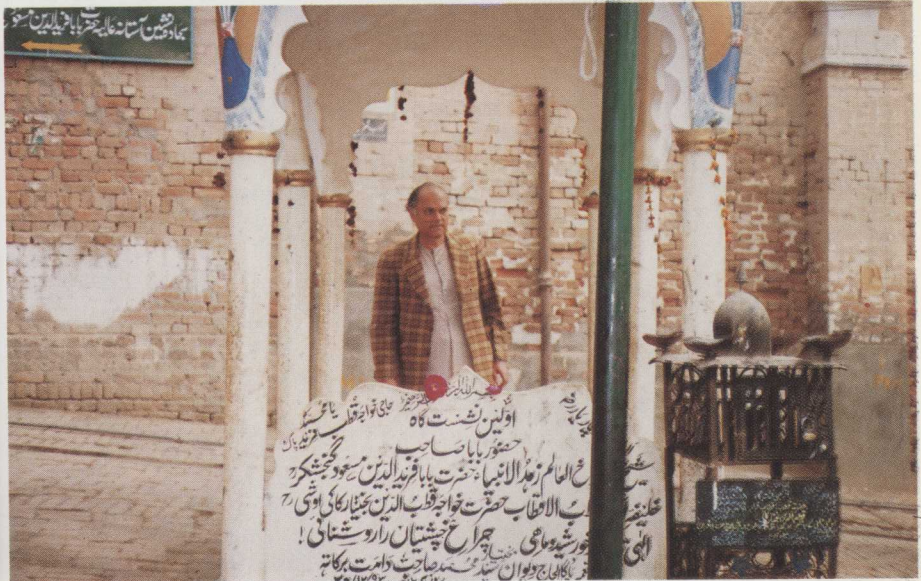
دہلی، ہانسی اور کھتوال چھوڑنے کے بعد فرید الدین مسعود اجودھن آ گئے۔
یہاں سانپ، بچھوؤں، درندوں اور "جانگلیوں" کا قرب تھا لیکن قرب سلطانی کا دھڑکا نہ تھا۔
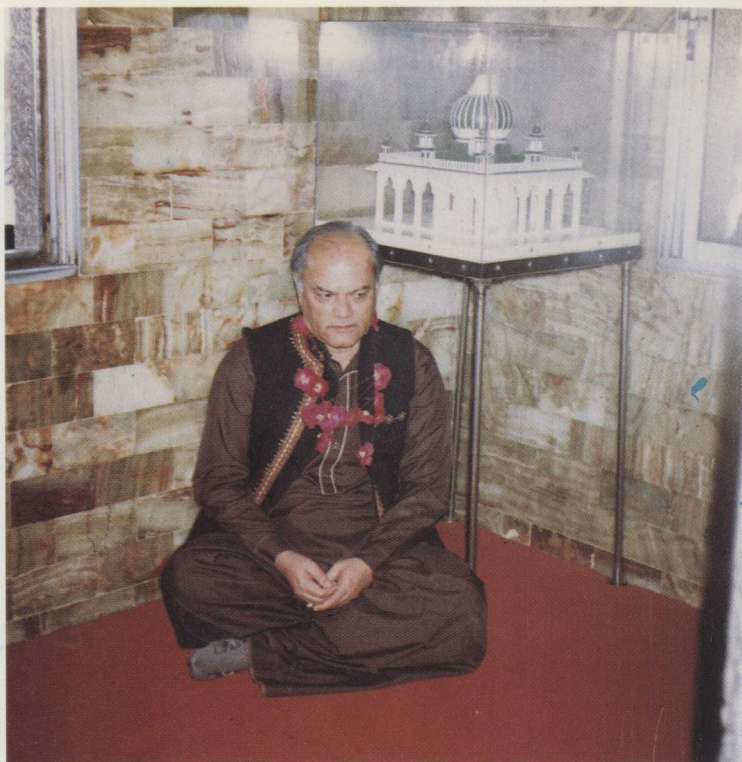
پاک پتن میں فرید الدین مسعود کے حقیقی بھانجے مخدوم علاؤالدین صابر کے حجرے کی جگہ۔
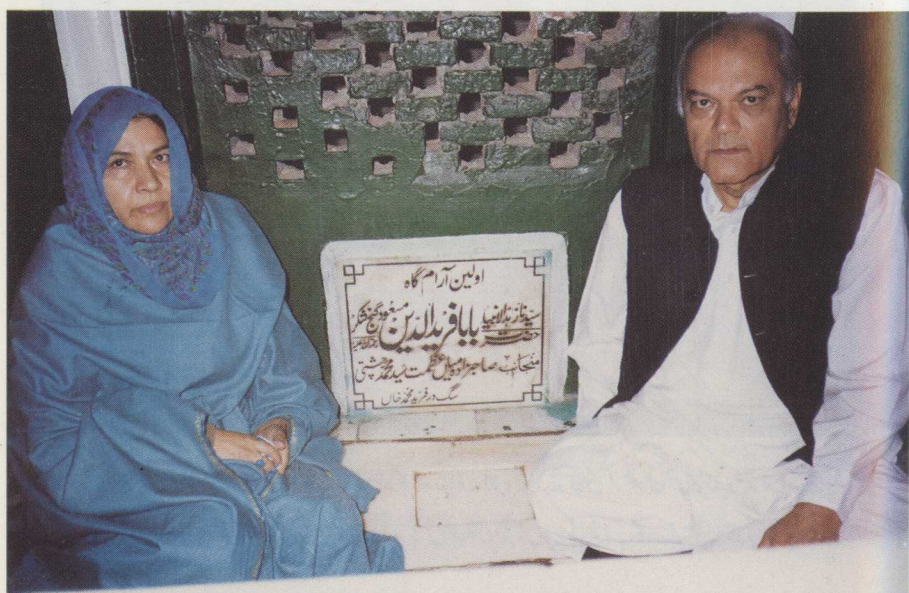
نوے سال پہلے آسمان نے زمین کو جو امانت سونپی تھی، آج زمین نے بہ صد احترام وہ آسمان کو لوٹا دی۔
خاک کو امانتہً خاک کے سپرد کر دیا گیا۔

خواجہ نظام الدین اولیاء اجودھن پہنچے تو مرشد کا جسد پاک اس لحد سے نکال کر جہاں اسے امانۃً رکھا گیا تھا، زمین کے اس ٹکڑے کو سونپا جو زندگی میں ان کی رہائش گاہ اور بعد میں ان کی خواب گاہ کے لیے مقدر کیا گیا تھا۔

ہے۔ اپنے عہدِ وزارت میں بلبن ایک دفعہ بابا صاحب کی خدمت میں پاک پتن حاضر ہوا تو آپ نے اسے سلطنتِ دہلی کی بشارت دی تھی۔

اگست ۱۹۹۰ء کے آخری ہفتے اسی مہرولی میں، خواجہ قطب کے پائنتی، ایک چھوٹے سے احاطے میں، ایک مقامی گائیڈ، ایک دو صحیح سالم، اور باقی اَدھ ٹوٹے مرمریں کتبوں کی مدد سے، مجھے ان مغل بادشاہوں کے نام بتا رہا تھا جو یہاں مدفون تھے۔ یہ شہنشاہِ ہند اورنگ زیب عالمگیر کے وہ پوتے، پڑپوتے اور سکڑ پوتے تھے جنہیں ان کی وصیت کے مطابق دِلّی کے خواجہ کے قدموں میں جگہ دی گئی، لیکن جن کے نام تک بھی دلّی کے ۱۹۴۷ء کے بعد کے مکینوں نے ان کتبوں پر دیکھنا گوارا نہ کیے۔ ان ٹوٹے پھوٹے کتبوں اور قبروں کے درمیان، دو گز زمین کا ایک ٹکڑا نمایاں تھا جس کا تعویذ ٹوٹا تھا، نہ کتبہ، کیوں کہ اس کا کبھی تعویذ بنا نہ کتبہ لگا اور نہ ہی اس میں کسی کو کبھی دفنایا گیا۔ زمین کا یہ ٹکڑا، آج تک کسی بانجھ کی گود کی طرح، خالی پڑا ہے۔ گائیڈ دھیرے دھیرے بتا رہا تھا ”آپ نے وہ شعر تو سنا ہوگا ؎

کتنا ہے بدنصیب ظفؔر دفن کے لیے

دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

آپ کی نظروں کے سامنے اس وقت وہی دو گز زمین ہے۔“

میں دیر تک اس دو گز زمین کو دیکھتا رہا جو بظاہر خالی ہے لیکن جس کے اندر ایک بہت بڑی اور بہت ہی دردناک تاریخ دفن ہے۔ صرف ایک شہر کے تباہ ہونے کی نہیں، ایک ملک کے برباد ہونے، ایک سلطنت کے مٹنے، ایک تہذیب کے اجڑنے، ایک قوم کے غلام ہونے، ایک عہد کے ختم ہونے اور ایک نئے دَور کے جنم لینے کی تاریخ۔ تاریخ ان ویران مقبروں اور خالی قبروں میں خدا جانے کیا کیا دکھلانا چاہتی تھی؟ اب یہ دیکھنے والے پر تھا کہ وہ کیا دیکھ سکتا ہے؟

✲✲✲✲✲

اس دو گز زمین کے سرہانے دیوار کے اُس پار جو ہستی محوِ خواب ہے اس کے مزار پر کوئی تعویذ ہے نہ تابوت، اب سے ساٹھ برس پہلے تک اس پر کھلے آسمان کا سایہ تھا۔ روایت ہے بوقتِ وصال حکم ہوا کہ میری قبر کچی، بغیر چھت کے، سطح زمین کے ساتھ اِس طرح ہموار رکھی جائے کہ کسی کو خبر نہ ہو پائے کہ میں کہاں دفن ہوں۔ کیا خبر اللہ کا کوئی پیارا میری لحد پر پاؤں رکھ کر گزر جائے اور اسی سے میری شفاعت ہو جائے۔ کہنے والا تو یہ کہہ کر، عالم سماع کے دوران، اس سے جاملا جس سے ملنے کی تڑپ اسے نہ جانے کب سے اور کتنا بے چین کیے ہوئے تھی، لیکن اس تڑپ کی فوری ضرب جونہی کوتھے وال میں پیدا ہونے والے ایک ملتانی کے دل پر لگی، تو وہ روتا دھوتا، بھوکا پیاسا، منزلیں مارتا ہانسی سے دِلّی پہنچا۔ روایت ہے اس عاشقِ کی رات کوئے یار اور دن شمسی تالاب پر گزرتا جہاں وہ دن بھر مٹّی کھودتا اور چلچلاتی دھوپ میں اپنے سر پر ٹوکریاں بھر بھر کر اس فرش پر ڈالتا جہاں اس کا محبوب، سب سے بے نیاز، محوِ خواب تھا اور جس جگہ کے بارے میں حکم تھا کہ سطح زمین کے ساتھ اس طرح ہموار رکھنا کہ کسی کو خبر نہ ہو پائے کہ میں کہاں ہوں۔ آج سے آٹھ سو برس پہلے ان مقدس ہاتھوں نے، اس پاک زمین پر جہاں جہاں مٹی ڈالی اور لیپی، اس کے گرد بعد میں چار دیواری بنا دی گئی۔ جہاں آج ایک سرے سے دوسرے سرے تک، ایک بڑے ہموار فرش پر، ایک صاف و شفاف چادر بچھی رہتی ہے جس پر با وضو نیاز مند کلامِ پاک کی تلاوت میں محو ہوتے ہیں۔ یہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا مزار ہے، ان کا عاشق زار کسی تعارف کا محتاج نہیں، وہ آج پاک پتن میں آسودہ خواب ہے اور اس کا ڈنکا چہار دانگِ عالم میں بج رہا ہے۔

*****

اگست دِلّی میں گرمی اور حبس کا مہینا ہوتا ہے جب میں خواجہ قطب الدین بختیار کے مزار کے احاطے میں داخل ہوا تو مطلع صاف اور موسم گرم تھا۔ جب نکلا تو دِلّی کی فضاؤں میں ٹھنڈی ہواؤں کا جھولا اور جھونکے تھے، آسمان پر گہرے کالے بادلوں کی

چھتری تنی تھی۔ میں ابھی سواری لینے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ بوندا باندی شروع ہوگئی۔ ایک موٹر رکشا سامنے سے گزر رہا تھا، اسے روکا۔ سوال ہوا ''بابو جی کہاں جاؤ گے؟'' جواب دیا ''خواجہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ۔'' آواز آئی ''آپ کا مطلب ہے سلطان جی کے دربار میں۔'' شاید آسمان والوں کو بھی رکشا والے کی یہ ترمیم بھا گئی۔ آسمانی بجلی کی ایک سیمیں اور سیمابی لہر، قطب مینار کے پیچھے، جھولتے ہوئے بادلوں میں لپکی، بادل زور سے کڑکے اور دیکھتے ہی دیکھتے چھما چھم برستے بارانِ رحمت نے ہر پیاسے کی جنم جنم کی پیاس بجھا دی۔

اِس جل تھل بارش میں سفید دُودھیا مَرمَریں گنبد کے نیچے طوطیٔ شکر مقال خسرو کی وہ گوری سو رہی ہے جس کا انتظار اب سے سیکڑوں برس پہلے، اور سیکڑوں میل دور، پاک پتن میں ہوا تھا۔ روایت ہے ایک دن دِلّی کی مسجد میں سلطان جی نے یہ آیت سنی جس کا ترجمہ ہے ''کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ایمان لانے والوں کے دل ذکرِ الٰہی سے گداز ہوجائیں؟'' آیت سن کر بے قرار ہوگئے اور پاک پتن کے لیے چل کھڑے ہوئے جہاں بے قراری کچھ کم نہ تھی۔ جب اللہ اور اللہ کی مخلوق کا یہ محبوب پاک پتن پہنچا تو خواجہ قطب کے عاشق زار اور درویشی کی اس شمع نے جس کے لیے رہتی دُنیا تک یہ فیصلہ سنا دیا گیا تھا کہ اس سے درویشی کا سلسلہ سدا روشن رہے گا، اس شعر سے مرید کا استقبال کیا ؎

اے آتشِ فراقت دلہا کباب کردہ　　　سیلابِ اشتیاقت جانہا خراب کردہ

بابا صاحب نے دُعا کی ''**الٰھی نظام الدین را محبوب گرداں.**'' وہ دن اور آج کا دن، محبوبِ الٰہی کے دربار پر یہ سیلابِ اشتیاق جاوداں اور فروزاں ہے۔ ہندو ہو یا مسلمان، سکھ ہو یا عیسائی، بچہ ہو یا بوڑھا، امیر ہو یا غریب، خواجہ نظام الدین دِلّی والوں کے محبوب اور سلطان جی ہیں۔ رَوضے کے پائتی کچھ فاصلے پر اس شخص کا سادہ سا مزار ہے جس سے بڑا نابغہ (Genius) برِصغیر پاک و ہند نے پیدا نہیں کیا۔ شاعر، سپاہی، موجد، موسیقار، ولی، سیاست دان، کیا تھا، جو وہ نہ تھا لیکن سب سے بڑھ کر وہ

سلطان جی کا عاشق تھا۔ سلطان جی نے امیر خسرو کو "ترك الله" کا خطاب دیا تھا، کہا کرتے تھے قیامت کے دن، جب ہر شخص سے پوچھا جائے گا کہ کیا لائے ہو تو کہوں گا کہ اس "ترك الله" کے سینے کا سوز لایا ہوں۔ فرمایا کرتے تھے اگر شریعت اجازت دیتی تو وصیت کرتا کہ خسرو کو میری قبر میں دفن کیا جائے۔ بہ ہر صورت اسے میری قبر کے پہلو میں دفن کرنا۔ جب سلطان جی اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے، تو خسرو، ہزار میل دور، بنگال میں تھے۔ اطلاع ملی تو دیوانہ وار دلّی پہنچے۔ مزار پر آئے تو زار زار روتے ہوئے کہا: ''سبحان الله ! آفتاب در زیرِ زمین و خسرو زنده۔'' وصالِ مرشد کے چھے ماہ بعد مرشد کی قبر کا پہلو تو نہیں، پائنتی نصیب ہوئی۔ سلطان جی کے مزار کے آس پاس، نہ جانے کتنے شہنشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کی قبریں ہیں لیکن خسرو جیسا نصیب بھلا کس کو نصیب ہوتا ہے؟

خسرو کے ہم عصر اور پیر بھائی نصیر الدین چراغِ دہلی تھے۔ جنہیں سلطان جی کے سب سے بڑے خلیفہ، جانشین اور صاحبِ ولایتِ دہلی ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اب سے ستاسّی برس پہلے، ۱۹۱۳ء میں، میرے دادا مولوی محمد عالم شاہ فریدی نے سالہا سال کی تحقیق کے بعد ''مزاراتِ اولیائے دہلی'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، جسے محکمہ آثارِ قدیمہ ہند نے اس شعبے میں سند تسلیم کیا تھا۔ اس کتاب میں چراغِ دہلی کے بارے میں تحریر ہے کہ ''جب مخدوم جہانیاں جہاں گشت، جن میں چودہ خاندانوں کی نعمت تھی، مکہ معظّمہ میں تھے تو اس وقت باوجودیکہ بہت سے اولیاء اللہ دہلی میں تھے، امام عبداللہ یافعی نے مخدوم جہانیاں سے فرمایا تھا کہ اس وقت نصیر الدین محمود سے دہلی کا چراغ روشن ہے۔ جب سے آپ روشن چراغ دہلی مشہور ہوگئے۔'' کتاب میں آپ کا تذکرہ اس فقرہ پر ختم ہوتا ہے کہ ''مزار آپ کا موضع چراغ دہلی میں مشہور ہے۔''

چراغ دہلی اب موضع نہیں، شہرِ دہلی کا حصہ بن چکا ہے، لیکن افسوس کہ وہاں کے

نئے مکینوں کو اس چراغ کا علم نہیں جس سے ان کی بستی روشن ہے۔ خاصی دیر اور بہت دور بھٹکنے کے بعد ایک دکان دار نے راہ نمائی کی تب گلی در گلی جا کر چراغِ دہلی کی آخری آرام گاہ کی زیارت نصیب ہوئی۔ مزار ایک نیلگوں چادر اور فضا سکون کی چادر سے ڈھپے تھے۔ خادمین نے بتایا کہ حضرت کو زندگی میں خامشی اور تنہائی پسند تھی، قدرت نے زندگی کے بعد بھی اپنے پرستار کی پسند کا خیال رکھا۔

*****

پچیس اگست ۱۹۹۰ء کو، میں اس در پر آن پہنچا جہاں پہنچنے کے لیے پیسہ نہیں بلکہ سچی خواہش، اور پاسپورٹ نہیں بلکہ تائیدِ ایزدی چاہیے۔ چند ایکڑ کے اس ٹکڑے میں کتنے بادشاہوں نے کتنی ہی نشانیاں چھوڑیں۔ محمود خلجی نے ایک بلند دروازہ تعمیر کرایا جو آج تک بلند دروازہ کہلاتا ہے۔ جلال الدین اکبر نے مسجد بنوائی اور ستر (۷۰) من کی دیگ نصب کرائی۔ شہاب الدین شاہ جہاں نے سنگِ مرمر کی نفیس اور کشادہ مسجد بنوائی۔ بعض روایتوں کے مطابق اس نے اور بعض کے مطابق اس کے باپ نور الدین جہانگیر نے ساٹھ (۶۰) من کی دیگ نصب کرائی۔ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر نے روضے سے متصل مسجد بنوائی۔ مزار کے پائنتی کی جگہ شاہ جہاں کی بیٹی حور النساء کے نصیب میں آئی اور درگاہ کے احاطے میں نصیر الدین ہمایوں کی جان بچانے والے سقّے کی قبر کی نشان دہی آج تک یہ کتبہ کرتا ہے: ''**المعین، مدفنِ شاہِ نیم روز بھشتی**۔'' شاہِ نیم روز، یعنی ''آدھے دن کا بادشاہ۔''

کسی کی بادشاہت آدھے دن اور کسی کی آدھے سے کچھ زیادہ دنوں میں ختم ہوگئی، آٹھ سو برس بیت گئے سلطان الہند کا فیض اور سکہ آج بھی جاری ہیں۔ مسلمانوں کی بات چھوڑیئے، سائیکل رکشا چلانے والے اس ہندو کی بات بھلا کون کافر بھول سکتا ہے جس نے میرے سوال کے جواب میں کہا ''بابو جی ! بھلا ہو سکتا ہے کہ اجمیر میں ہوں اور غریب نواز کے دروازے پر حاضری نہ دوں لیکن بابو جی ہم غریب لوگ ہیں، بڑے دروازے

سے ہی مہاراج کو سلام کر کے چلے جاتے ہیں۔'' اور جب اس نے مجھے درگاہ کے سب سے بیرونی بلند دروازے پر، جو نظامِ حیدر آباد نے بنوایا تھا، اتارا تو اپنی رکشا ایک طرف کھڑی کر کے، دروازے کی پہلی پتھریلی سیڑھی پر ماتھا ٹیک کر، اپنے مہاراج کو دور سے سلام کیا، ہاتھ جوڑے اور اُلٹے پاؤں واپس ہولیا۔ میں سر اُٹھائے بڑے اطمینان سے بڑے دروازے کے اندر چلا گیا۔ بڑا دروازہ اپنی بلندی سے میری پستی دیکھتا رہا...... کیا میں اس ہندو سے بہتر تھا؟

*****

آج اگست کی آخری تاریخ تھی۔ میں دوبارہ لاہور میں تھا۔ جمعے کی صبح، اکتیس اگست ۱۹۹۰ء میں اس ہستی کے دربار میں حاضر ہوا جسے سلطان الہند نے گنج بخش کہا تھا۔ گنج بخش کے پائنتی اور غریب نواز کے حجرۂ اعتکاف کی دودھیا مَرمَریں جالی کے سامنے، میں سچے دل سے خدا کا شکر بجا لایا۔ عرصہ ہوا کسی نے یہ دعا لکھوائی تھی ''اے خدا مجھے وہ دے دے، جو میں مانگ نہیں سکتا۔'' داتا ایک ہی ہے اور وَحدَہٗ لَا شَرِیك ہے۔ جب دینے پر آتا ہے، تو اتنا دیتا ہے، ایسوں سے دلواتا ہے اور ایسے دلواتا ہے کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ اس موقع پر اگر ہوش سلامت رہیں تو شکر بجا لانا ہی بہت ہے اور اگر یہ شکر کہیں قبول ہو جائے تو اور کیا چاہیے؟ ع ''یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے۔''

*****

اکتیس اگست اُسی جمعے کی دوپہر، میں اس بلند پہاڑی پر چڑھا جہاں اب سے ساڑھے سات سو برس پہلے، ایک نعرۂ مستانہ گونجا تھا اور عرش کے کنگوروں سے ٹکرا کر کائنات کی فضاؤں میں پھیل گیا تھا: ''چالیس برس مسعود نے وہی کیا جو اللہ نے چاہا، اب جو مسعود چاہتا ہے، وہ کر دیا جاتا ہے۔''

ملتان سے کوئی دس میل دور، کوتھے وال کے قصبے میں پیدا ہونے والا یہ عظیم شہ باز

جس کا ٹھکانا سِدرَۃُالمنتہیٰ، جس کی روح عرفانی، جسم نورانی اور زبان ملتانی تھی، جس کے بعض اشعار گرنتھ صاحب کا حصہ کہے جاتے ہیں، جو جیا اور مرا علاقہ ملتان میں، لیکن جس کا پیر بھی دِلّی کا خواجہ، اور مُریدِ خاص بھی دِلّی کا خواجہ تھا، جس کے لیے سُلطان اُلہند نے قُطب الاقطاب سے کہا تھا ''بختیار! تم ایک ایسے شہ باز کو دام میں لائے ہو جو سِدرَۃُ المُنتہیٰ سے ورے ٹھکانا نہ کرے گا، فرید ایک شمع ہے جس سے درویشی کا سلسلہ سدا روشن رہے گا۔'' اس درویشِ خدا مست کی زِندگی کا کچا جھونپڑا آج اس کی ابدی آرام گاہ ہے، جہاں سات صدیاں پہلے یَاحَیُّ یَا قَیُّومُ کہتے کہتے، یہ شہ باز بالآخر سِدرَۃُ المُنتہیٰ سے پرے پرواز کر گیا۔ اس کا یہ چھوٹا سا جھونپڑا، آج بھی، بے چین دلوں کے لیے قبلۂ تسکین اور اس کا کونہ کونہ، مشکِ عشق کی مہک سے معطر ہے۔ جنوب میں قبر کے عین پائنتی پونے چھ فٹ اونچا اور ڈھائی فٹ چوڑا وہ دروازہ ہے جو خواجہ نظام الدین اولیاء سے منسوب مشہور روایت کے مطابق، بابِ جنت کہلاتا ہے۔

اس جھونپڑے کے مشرقی دروازے کے باہر اور بالکل ساتھ وہ چھوٹی سی مسجد ہے جہاں خواجہ نظام الدین اولیاء نے اعتکاف کیا تھا۔ باباجی کی یہ جھونپڑی جس کے اوپر اب دُودھیا سنگِ مَرمَر کے ٹائلوں کا ایک خوب صورت گنبد بن چکا ہے، بابا جی کا دربار کہلاتا ہے۔ نیلی بار کے وحشی قبیلوں کی اولاد جو ساہیوال، اوکاڑہ اور پاک پتن کے اضلاع میں آباد ہے، روزانہ سیکڑوں، بلکہ ہزاروں، کی تعداد میں، برہنہ پا، اس دربار میں حاضری دیتے ہیں اور ان کے ساتھ، خدا جانے، باباجی کے کون کون سے چاہنے والے اور کون کون سی مخلوق کہاں کہاں سے آ کر موجود ہوتی ہے۔ درویشی کی اس شمع کے گرد اِن جانے، اَن جانے، دیکھے اور اَن دیکھے پروانوں، مستانوں اور پرستاروں کا رقص، سات صدیوں سے برابر جاری ہے۔ سفید گنبد کے نیچے یا باہر جب کوئی سرمست درویش نعرۂ فرید کی مستانہ صدا دیتا ہے تو ہر موجود ذی حیات کی زبان سے ایک ساتھ، بلند آواز میں، ایک ہی نعرۂ مستانہ بلند ہوتا ہے:

''حق فرید یا فرید حق فرید بابا فرید''

اور یہ نعرۂ حق اس بلند پہاڑی سے بلند ہو کر اس اَزلی، اَبدی اور سرمدی آواز میں جاملتا ہے جو آج بھی نیلی بار کی فضاؤں اور آسمان کی نیلی چھت کے نیچے ویسے ہی گونج رہی ہے جیسے آج سے سات صدی قبل، پہلی بار گونجی تھی: ''چالیس برس مسعود نے وہی کیا جو اللہ نے چاہا، اب جو مسعود چاہتا ہے، وہ کر دیا جاتا ہے۔''

۲۵/اگست سے ۳۱/اگست ۱۹۹۰ء کا یہ سفر، اللہ جانے، سات روز کا تھا یا سات صدیوں کا، لیکن جو بھی تھا ایک خواب کی طرح آیا اور گزر گیا۔ اس سفر میں، میں جہاں جہاں گیا، پھول چنتا گیا اور انہیں احتیاط سے جمع کرتا رہا۔ آج شام ایک آدھ گھڑی بعد ہر شروع ہونے والے سفر کی طرح یہ سفر بھی ختم ہونے والا تھا۔

۳۱/اگست ۱۹۹۰ء کے ڈوبتے سورج کی سنہری اور ملائم کرنیں، ملتان کے افق کے مغربی کناروں پر سمٹ کر، شفق بن کر طلوع ہونے کے لیے مچل رہی تھیں کہ میں شاہراہِ پاکستان پر واقع ایک قصبے کبیر والا میں رُکا۔ ایک قرض تھا جو مجھے اس طرح دِلّی لے گیا تھا جیسے کسی پُرانے قرض دار کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال کر کشاں کشاں لے جاتے ہیں۔ ایک فرض تھا جس نے مجھے آج یہاں ایسے روک لیا تھا جیسے پاؤں میں بیڑی پڑ گئی ہو۔ میں نے یہ سارے مہکتے مسکراتے پھول ایک مہکتی ہوئی قبر کے سرہانے رکھ دیئے۔ قبر کے سرہانے دُودھیا سنگِ مَرمَر کا ایک قدِ آدم کتبہ تھا جس پر بہت بڑے بڑے جلی حروف میں الفاظ کندہ تھے: ''امّی جان''

خدا جانتا ہے ان پھولوں کو سجانے کی اس سے بہتر جگہ پوری دُنیا میں نہیں تھی۔

مندرجہ بالا مضمون مصنف کی کتاب ''اوراق پریشاں'' سے لیا گیا ہے۔

مزاراتِ اولیائے دہلی

پر مولانا حالؔی کا تبصرہ

ستاسی برس پہلے، ۱۹۱۳ء میں، میرے دادا مولوی محمد عالم شاہ فریدی نے، سالہا سال کی تحقیق کے بعد، ''مزاراتِ اولیائے دہلی'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جسے محکمۂ آثارِ قدیمہ حکومتِ ہند نے سند کے طور پر تسلیم کیا اور اپنی مطبوعات میں جابجا اس کے حوالے درج کیے۔ مولانا محمد علی جوہرؔ کے مشہور اُردو روزنامے ''ہمدرد'' میں ۲۱ فروری ۱۹۱۴ء کو، اِس کتاب پر، خواجہ الطاف حسین حالؔی کا تبصرہ شائع ہوا جو درجِ ذیل ہے:

''یہ کتاب مولوی محمد عالم شاہ فریدی حقی دہلوی نے ان بزرگوں کے مزارات پر تحقیقات کے بعد لکھی ہے جو ابتدائے اسلام سے اخیر زمانہ تک، دہلی ونواحِ دہلی میں دفن ہوتے رہے اور جن سے دہلی کے تقریباً تمام موجودہ شریف اور معزز خاندان کسی نہ کسی طرح کا قوی تعلق رکھتے ہیں۔ بہت سے خاندان خود ان بزرگوں کی اولاد ہیں اور اولاد ہونے کے علاوہ ان سے نیاز مندانہ عقیدت وارادت رکھتے ہیں۔ اکثر خاندان اگرچہ ان کی اولاد میں سے نہیں لیکن اولاد سے زیادہ ان کی تعظیم وتکریم اور ان کے مزاروں کی بزرگ داشت کرتے ہیں۔

اگرچہ معزز مصنف، کئی برس سے، اِس کتاب کی تیاری میں مصرف تھے لیکن حسنِ اتفاق سے، اس کی اشاعت، عین اس وقت ہوئی ہے جب دہلی کے مسلمان باشندوں کے علاوہ خود گورنمنٹ کو اس سے مدد لینے کی ضرورت تھی، جب سے دہلی دارالحکومت قرار دی گئی ہے، سب کو اس بات کا یقین ہے کہ شہر کے اندر اور باہر نئی سڑکوں اور جدید

مندرجہ بالا تبصرہ مصنف کی کتاب ''اوراق پریشاں'' سے لیا گیا ہے۔

عمارات کے ذریعے ایک انقلابِ عظیم ہونے والا ہے۔ جو خوشی باشندگانِ دہلی کو، دارالحکومت کی تبدیلی سے ہوئی تھی، اس سے زیادہ تشویش، اس انقلاب کے تصور سے، تمام اہلِ دہلی کے دل میں پیدا ہوگئی ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کو، بہ نسبت دیگر اقوام، زیادہ اندیشہ ہے کیوں کہ دہلی اور نواحِ دہلی میں جس قدر ان کے بزرگوں کے مزارات ہیں اور جن سے قدرتی طور پر ان کو از حد تعلق ہے، ان کو خوف ہے کہ مَبادا اِس انقلاب میں وہ دَرہم بَرہم نہ ہوجائیں۔ ایسے وقت میں اِس کتاب کا شائع ہونا امید ہے کہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

اگرچہ مزاراتِ اولیائے دہلی کے حالات، اوران کے پتے اور نشان، اکثر کتابوں میں درج ہیں لیکن جیسا کہ مصنف نے بیان کیا ہے، اوّل تو ان میں مزارات کے پتے اور نشان بہت مجمل و مختصر لکھے تھے، اس کے علاوہ اکثر مقامات کے نام امتدادِ زمانہ کے سبب بدل گئے یا بالکل معدوم ہوگئے تھے، پھر اکثر مزارات کے نام اور پتے خادموں نے لوگوں کو بلا تحقیق اصلیت، بتابتا کر، غلط مشہور کردیئے تھے۔ اِن وجوہ سے، معزز مصنف نے یہ کتاب لکھنی شروع کی اور کئی برس نواحِ دہلی کے مزارات کی تحقیقات میں بسر کیے۔ مختصر پتوں کو کافی تفصیل کے ساتھ لکھا اور جو پتے اور نام غلط مشہور ہوگئے تھے ان کو نہایت معتبر اور مشہور کتابوں سے صحیح کیا، کتابوں کے علاوہ دیگر ذرائع سے ان کا کھوج لگایا اور اس طرح اس کٹھن منزل کو نہایت صبر و استقلال سے طے کرکے دہلی کے تمام مسلمانوں کو مرہونِ منت کیا۔

اس کتاب کے ترتیب دینے والے محمد عالم شاہ اس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو ہندوستان کی اسلامی دنیا میں مثل چاند اور سورج کے روشن اور نمایاں ہے، یعنی حضرت بابا فریدالدین شکر گنج ؒ کی اولاد اور شیخ عبدالحق ؒ محدث دہلوی کے نواسے ہیں۔ اس کے سوا خود بھی صاحبِ علم ہیں۔ اگر میرا خیال غلط نہ ہو تو جس مضمون پر یہ کتاب لکھی گئی ہے

اس کے لیے ان سے بہتر آدمی ملنا بہت مشکل تھا۔ اوّل تو آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کا خیال مطلقاً بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے، خصوصاً مزاراتِ اکابر و اسلاف کی چھان بین کرنے میں اس قدر کوشش بلیغ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خود بزرگوں کے اخلاف ہیں۔ بہرحال محمد عالم شاہ صاحب نے یہ رسالہ لکھ کر دہلی اور نواح دہلی کے عام مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے جس کی کچھ تلافی، دعائے خیر کے سوا نہیں ہو سکتی۔

فجزاهم الله عناوعَن سائر المسلمين خير الجزاء و آخر دعوانا ان الحمد للهِ رب العالمين۔

(راقم الطاف حسین حالی۔ ۲۳ جولائی ۱۹۱۳ء)

''اوراقِ پریشاں''

پر چند تبصرے

پروفیسر ڈاکٹر اسلم فرخی

میری میز پر گنتی کی جو چند کتابیں رکھی ہوئی ہیں ان میں ایک چھوٹی سی کتاب مجھے بہت عزیز ہے۔ میں اسے گاہے گاہے اٹھاتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے لیے بڑے اطمینان اور سکون سے مطالعہ کرتا ہوں اور پھر واپس رکھ دیتا ہوں۔ کتاب کا نام ہے ''مزاراتِ اولیائے دہلی۔'' میرے پاس اس کا تیسرا ایڈیشن ہے۔ پہلا ۱۳۳۰ھ میں، دوسرا ۱۳۴۶ھ میں، اور تیسرا قیامِ پاکستان کے بعد شائع ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''مزاراتِ اولیائے دہلی'' ایک مقبول کتاب ہے۔ مجھے حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہیؒ کے رَوضہ مُبارک کی تفصیل کی وجہ سے اس کتاب سے دلچسپی ہے۔ مؤلف ہیں: مولوی محمد عالم شاہ فریدی جن کی ذاتی معلومات اور دید و دریافت اس کتاب کے دیباچے اور مندرجات سے ظاہر ہوتی ہے۔

اتفاق یہ ہے کہ جب میں نے فیروز الدین احمد فریدی کی کتاب ''اوراقِ پریشاں'' پڑھنا شروع کی تو نظر سب سے پہلے ''مزاراتِ اولیائے دہلی'' کے عنوان پر ٹھہری اور یہ پڑھ کر خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی کہ فیروز الدین احمد فریدی، مؤلف مزاراتِ اولیائے دہلی مولوی محمد شاہ عالم فریدی کے نبیرے ہیں۔ علم و دانش میں میراث نہیں چلتی مگر فیروز الدین احمد فریدی صاحب اور ان کے والد فصیح الدین احمد مرحوم بھی مصنف، اور دادا بھی مصنف۔ ''ایں سلسلہ از طلائے ناب است۔'' ایسا حسن اتفاق کم ہوتا ہے۔

''اوراقِ پریشاں'' کے عنوان سے مجھے ایک اور دہلوی انشا پرداز ''صلائے عام'' والے میر ناصر علی یاد آئے۔ میر صاحب ''صلائے عام'' میں ''مضمونِ پریشاں'' کے عنوان

سے ایک خصوصی مضمون لکھا کرتے تھے۔ البیلے نثر نگار تھے۔ لکھتے کیا تھے خیال و زبان کے پھول کھلاتے تھے۔ ''اوراقِ پریشاں'' میں بھی مجھے خیال و زبان کے وہی پھول جا بجا مہکتے محسوس ہوئے۔ یہ دل آویز کتاب جسے مصنف نے از راہِ انکسار ''اوراقِ پریشاں'' کا نام دے دیا ہے، درحقیقت ایک گلدستہ ہے۔ فطری سلیقے، نفاست اور دقتِ نظر سے تیار شدہ، پندرہ مضامین پر مشتمل اس مجموعے میں مصنف کا ماضی اور حال بھی جگمگا رہا ہے۔ کچھ طنزیئے بھی ہیں اور مشہور انگریزی افسانہ و ناول نگار سمرسٹ مام کے ایک افسانے کا ترجمہ بھی ہے، مگر جو کچھ بھی ہے اس سے فیروز الدین احمد فریدی کے ادبی مزاج اور رچے ہوئے اسلوب کی نشان دہی ہوتی ہے۔

نظر اپنی اپنی اور پسند اپنی اپنی والی بات ہے۔ فیروز الدین احمد فریدی کے طنزیئے خوب صورت، بھرپور اور معنی خیز ہیں۔ ایک ایک جملے میں جہانِ معنی سموئے ہوئے ہیں۔ ترجمہ بھی بڑا رواں دواں اور دلچسپ ہے، مگر مجھے ان کے وہ سارے مضامین جو ان کی ذات، ان کے ماضی اور ان کی عقیدتوں اور محبتوں سے تعلق رکھتے ہیں، بڑے پُر اثر محسوس ہوئے۔ دادا نے ''مزاراتِ اولیائے دہلی'' کی نشان دہی کر کے خاص و عام کو وہاں کی حاضری کی دعوت دی تھی۔ پوتے نے نشان دہی سے فائدہ اٹھا کر زندگی، رونق اور تقدس سے مالا مال ان درگاہوں کی عظمت و معنویت کو اپنے تمام قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ان کے بیان میں جو محبت اور خلوص ہے، دردِ عشق کی جو کسک ہے، واماندگی اور مہجوری کی جو گونج ہے، وہ ہر قاری کے دل کو چھو لیتی ہے۔ اس میں ماضی پرستی کا کوئی شائبہ نہیں، کھوئی ہوئی منزلوں کی یاد ہے۔ یادیں ہر انسان کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ فیروز الدین احمد فریدی کی ایک یاد نے ''امّی جان'' کا زندہ روپ دھار کر نجانے کتنے دلوں میں محبت اور خلوص کے چراغ روشن کیے ہیں۔ یہ مضمون، یا خاکہ، مصنف کی چشمِ جہاں بین سے ٹپکا ہوا وہ آنسو بھی ہے جو گاہے دلِ عاشق اور گاہے زمانہ بن جاتا ہے۔ زمانے کی سفا کی مشہور ہے۔ اس کا اندازہ امّی جان کا علاج کرنے والے مسیحاؤں کے ''پسندیدہ'' طرزِ عمل سے ہوتا ہے اور دلِ عاشق کی ناصبوری اس تڑپ سے ظاہر ہے جس

نے اپنی ماں کی جدوجہد کو ہمیشہ زمانے سے نبرد آزما دیکھا۔ بڑی پُر تاثیر تحریر ہے۔ایسی تحریریں کم لکھی جاتی ہیں۔

دراصل فیروز الدین احمد فریدی محبتوں اور عقیدتوں کے ثنا خواں ہیں۔ ان کا اسلوب بڑا روشن، نکھرا نکھرا، اور دل آویز ہے۔ مجھے اکثر جگہ یہ محسوس ہوا، جیسے وہ خود نہیں لکھ رہے، بلکہ مضمون اپنے آپ کو ان سے لکھوا رہا ہے۔مضامین کا یہ مجموعہ جس میں ایک واضح ربط، تسلسل اور مصنف کی شخصیت کا گہرا عکس ہے، بڑا دِل آویز اور پُر اثر مرقع ہے۔ میں مشتاق احمد یوسفی صاحب کی اس رائے سے پوری طرح متفق ہوں کہ فیروز صاحب ماضی قریب کے بارے میں بھی، جس نے انہیں بہت کچھ دیا ہے، اسی حسن و خوبی کے ساتھ خامہ فرسائی کریں گے۔ مجھے ابھی سے اس خامہ فرسائی کا انتظار ہے۔

(نوٹ: یہ تبصرہ ریڈیو پاکستان کے صبح گاہی، قومی رابطے کے پروگرام ''صبحِ پاکستان'' میں پچیس اکتوبر ۱۹۹۳ء کو نشر ہوا۔)

*****

حکیم محمد سعید

نامہ گرامی مورخہ ۸ر دسمبر (۱۹۹۳ء) کے لیے شکر گزار ہوں۔ ''اوراقِ پریشاں'' کا ایک نسخہ مل گیا ہے۔ ممنون ہوں۔ میں اس کتاب پر تبصرے پڑھتا رہا ہوں۔ خود میں نے اسے جستہ جستہ دیکھا ہے اور آج تمام تنقیدات کو بھی دیکھا ہے۔آپ نے یہ نہایت حسین ادبی تخلیق پیش کر کے جہانِ ادب میں ناقابل فراموش کام کیا ہے۔

بہ احتراماتِ فراواں

****

شان الحق حقی

میں نے یہ مضامین بڑی دلچسپی سے پڑھے اور مجھے بہت پسند آئے، خصوصاً وہ جو سوانحی اور وارداتی ہیں۔ ان کا لہجہ رواں اور بے تکلف ہے اور عبارت خوش اسلوب۔ بیان میں سچے افسانے کا سا لطف ہے۔ یہ ایک طرح کے رپورتاژ ہیں، لیکن رپورتاژ میں جو

تخیل یا شاعری اور افسانے کی ایک گونہ آمیزش ہوتی ہے، وہ ان میں نہیں۔ ان کی ادبیت سلیقۂ اظہار پر مبنی ہے۔ اس میں اتنی تاثیر ہے کہ ناظر مصنف کے غم میں دل سے شریک ہو جاتا ہے۔

*****

مشتاق احمد یوسفی

فیروز الدین احمد فریدی کا اسلوب سادہ، پُر تاثیر اور دلنشین ہے۔ بچپن سے متعلق اپنی یادوں کو وہ بڑے سلیقے اور ہنر مندی سے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ کہانی کا گمان ہوتا ہے۔ ان کی جزئیات نگاری میں، جو حشو و زوائد سے پاک ہے، ایک فطری سادگی اور روانی ہے۔ وہ اپنی دادی کو اپنے بیٹے (یعنی مصنف کے والد مرحوم) کی قبر کے نزدیک زمین پر چادر ڈال کر پنج سورے کے پیلے اوراق اور قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے دکھاتے ہیں تو ساتھ ہی ایک جھلک اس بچے کی بھی دکھا دیتے ہیں جو ''آسمان پر اُڑتی ہوئی بھوری چیلوں کو دیکھتا رہتا یا ان کالے اور بھورے رنگ کے چیونٹے چیونٹیوں کو جو قبروں کے اوپر یا اردگرد رینگتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی جب کوئی مہم جو چیونٹا یا چیونٹی ہماری چادر پر چڑھنے کی کوشش کرتا تو میں اپنی شہادت کی انگلی انگوٹھے سے ملا کر اسے پرے پھینک دیتا۔'' اپنے دلکش اندازِ بیان سے وہ ماضی کی یادوں کو حسین تر بنا دیتے ہیں، مگر نہ اس طرح کہ اس پر ناسٹلجیا کا گمان ہو۔ مجھے امید ہے کہ وہ ماضی قریب پر بھی، جس نے ان کو بہت کچھ دیا ہے، اسی حسن و خوبی کے ساتھ خامہ فرسائی کریں گے۔

*****

راغبؔ مراد آبادی

اس جنسِ گراں ارز کو ارزاں نہ کہو
ہرگز بھی کم از لعلِ بدخشاں نہ کہو
ماضی کی ہیں یادوں کے خزانے ان میں
راغبؔ انہیں ''اوراقِ پریشاں'' نہ کہو

جگن ناتھ آزاد

آپ کی یہ تصنیفِ لطیف، اوّل سے آخر تک پڑھنے کا موقع گزشتہ ہفتے پونے کے سفر میں ملا۔ اس وقت تک آپ کے اسم گرامی اور آپ کی تحریر دل پذیر سے واقفیت نہیں تھی۔ اس کتاب نے آپ کا گرویدہ بنا دیا۔ ''امّی جان'' والے باب کی داد میرے آنسوؤں نے دی۔ خداوند کریم نے کتنا عمدہ، تاثیر سے لبریز، اندازِ بیان آپ کو عطا کیا ہے ۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

آپ جب اپنے والدِ محترم کی قبر کی تلاش میں، انڈین ایکسپریس کے دفتر کے عقب میں واقع قبرستان میں، یونس صاحب اور حکیم صاحب کے ساتھ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر جا رہے تھے تو میں آپ کے ساتھ تھا، قدم بہ قدم۔ جب آپ قبر کی تلاش میں کامیاب ہو گئے تو مجھے ایک ایسا اطمینانِ قلب نصیب ہوا جسے میں شاید لفظوں میں بیان نہ کر سکوں...... یہ سب آپ کے دل آویز پیرایہ اظہار کا کرشمہ ہے...... مجھے اپنی محرومی کا رہ رہ کر احساس ہو رہا ہے کہ میں کیوں اس وقت تک آپ سے اور آپ کی تحریر دل پذیر سے نا آشنا رہا۔

اب میں پچھتر برس کا ہو رہا ہوں۔ اس عمر میں ہر بات یاد بھی نہیں رہتی۔ خیر اب جو آپ کے ساتھ ایک تعلق خاطر پیدا ہوا ہے، اس کتاب ''اوراقِ پریشاں'' کی بدولت، یہ انشاء اللہ جاودانی تعلق خاطر ہے۔ خواہ خط و کتابت ہو یا نہ ہو، ملاقات ہو یا نہ ہو۔

*****

روزنامہ نوائے وقت

(۱/۸ اکتوبر ۱۹۹۳ء)

حکومتِ پاکستان کے ایڈیشنل سیکریٹری فیروز الدین احمد فریدی گزشتہ تیس چالیس برسوں سے اُردو اور انگریزی کے اخبارات و رسائل میں اپنے تاثرات و خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ وہ دہلی کی مشہور و معروف شخصیت اور خواجہ حسن نظامی کے ہم عصر جناب فصیح الدین احمد کے فرزند ہیں جن کا انتقال قیامِ پاکستان سے قبل ۱۹۴۶ء میں

چالیس برس کی عمر میں ہوگیا تھا۔ تب فیروز الدین احمد فریدی کی عمر صرف دس برس تھی۔
تب سے ان کی بیوہ ماں اور بھائی بہنوں کی زندگی جن کڑے امتحانوں اور آزمائشوں سے
دوچار ہوئی ان سے یہ کندن بن گئے اور ان کے تاثرات اور احساسات کی شدت نے ان
کی تحریروں کو فطری طور پر انتہائی اثر انگیز بنا دیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب ان کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے، منتشر ہونے کے باوجود جن میں
ایک ربط و تسلسل باہم ہے۔ یہ مضامین بچپن کی یادوں، دِلّی لٹنے کے بعد بے یار و مددگار
کنبے کا پاکستان آنا اور یہاں آ کر کبیر والا کے قصبے میں آباد ہونا اور اس کے بعد شدائدِ زمانہ
کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھنا۔ پھر ماں کا انتقال، والد کے بارے میں کم سنی کی یادیں۔
۳۶ برس بعد دہلی جا کر ان کی قبر تلاش کرنا۔ تعلیمی زندگی کے اہم واقعات، اولیاء اللہ
سے عقیدت اور مزارات کی زیارت، دورۂ مشرقی پاکستان اور یادِ رفتگان کے عنوان سے
اور بہت سی باتیں...... مگر یہ سب کچھ ایک شخص کے ذاتی احساسات پر مبنی، جن کو آپ بیتی
بھی کہہ سکتے ہیں اور جن میں کسی حد تک رپورتاژ کا رنگ بھی ہے۔ زبان و بیان کی
سلاست و سادگی، اس پر تاثرات کی شدت، جو کبھی لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتی ہے اور
کبھی آنکھوں کے گوشوں کو نم کر دیتی ہے اور پڑھنے والا خود بھی لکھنے اور بیان کرنے
والے کے غم میں خود کو شریک محسوس کرتا ہے۔

اس کتاب کے ہر مضمون میں سب سے زیادہ جو چیز متاثر کرتی ہے وہ شدتِ
جذبات اور احساسات ہے۔ بہت کم لکھنے والوں کو یہ کمال حاصل ہوتا ہے کہ وہ قاری کو
اپنا آپ بھلا کر ذہنی و جذباتی سفر میں اپنا ہم سفر بنا لیں۔

''اوراقِ پریشاں'' میں دو ایک مضمون طنزیہ بھی ہیں اور سمرسٹ مام کے ایک
افسانے ''ماں'' کا ترجمہ بھی۔ مختصر یہ کہ جو کچھ بھی سول سروس کے اس اعلیٰ افسر نے لکھا،
اس کی ہر سطر پڑھنے کے قابل ہے۔ بہت کم سرکاری افسروں میں کامیاب ادیب کی یہ
خوبیاں ہوتی ہیں۔

روزنامہ جنگ

(۱۲؍نومبر ۱۹۹۳ء)

اس غیر مجلد کتاب میں پندرہ مضامین یا تحریریں شامل ہیں جو کسی ایک صنف ادب سے تعلق نہیں رکھتیں بلکہ ان میں رنگا رنگی ہے۔ فیروز الدین احمد فریدی صاحب اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہیں اور انہوں نے زندگی میں جو مشاہدات و تجربات کیے ہیں، اس کتاب میں ان کی جھلک مختلف انداز میں ملتی ہے۔ اس میں اردو کے بعض نامور ادیبوں کے اقتباسات بھی ہیں اور انگریزی کے معروف ادیب سمرسٹ مام کے ایک افسانے کا ترجمہ بھی ہے، مزاحیہ اور طنزیہ مضامین بھی ہیں، سفرنامہ بھی ہے اور انشائیے بھی ہیں۔ یہ تمام مضامین اس سے پہلے رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں اور اب انہیں مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں جناب مشتاق احمد یوسفی تحریر کرتے ہیں کہ ”فیروز الدین احمد فریدی کا اسلوب سادہ، پُر تاثیر اور دل نشیں ہے۔ بچپن سے متعلق اپنی یادوں کو وہ بڑے سلیقے اور ہنرمندی سے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ کہانی کا گمان ہوتا ہے۔“ کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان مضامین میں مصنف کی یادوں کی جھلکیاں ہیں جو انہوں نے مختلف انداز میں تحریر کی ہیں اور اب اپنے ساتھ قارئین کو بھی ان سے لطف اندوز ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ میں نے اوپر بتایا ہے کہ اس میں جو مضامین یا تحریریں شامل ہیں وہ مختلف انداز کی ہیں اور ان میں سوچ کی رنگا رنگی ہے، اسی لیے کتاب پر ناشر نے لکھا ہے کہ ”ایسے عجیب و غریب مجموعۂ مضامین کا نام ”اوراقِ پریشاں“ کے سوا کیا ہو سکتا تھا؟“ فیروز الدین احمد فریدی صاحب اُردو کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی لکھتے ہیں، چنانچہ انگریزی زبان میں بھی ان کی ایک کتاب شائع ہو چکی ہے اور اب ان کے اُردو مضامین کا یہ مجموعہ طبع ہو کر سامنے آیا ہے۔

✲✲✲✲✲

اخبارِ خواتین، کراچی
(۱۰ تا ۱۶/اگست ۱۹۹۳ء)

سیاسی ابتری، معاشی بدحالی اور ادبی پژمردگی کے اس دَور میں کسی اچھی کتاب کا، اچھی طرح شائع ہونا، وجہِ مسرت بھی ہے اور ہمت کا کام بھی۔ ان حالات میں، ایک ہی برس میں، ایک نہیں دو کتابوں، ایک اُردو اور دوسری انگریزی میں، کی تصنیف اور سلیقے سے اشاعت، مسرّت اور ہمت کے علاوہ باعثِ حیرت اور تقویت بھی ہے۔ مصنف کی انگریزی کتاب Adventures in Self-Expression کے نام سے ہے۔ اُردو کی کتاب ''اوراقِ پریشاں'' موجودہ دَور کے ایسے ادب نواز مگر انتہائی مصروف قاری کی پسند اور ضرورت کو سامنے رکھ کر مرتّب کی گئی ہے، جسے جدید نثری ادب کی تمام اصناف پڑھنے کا ذوق بھی ہے اور شوق بھی، لیکن پڑھنے کا وقت نہیں ہے۔ اس کتاب میں انگریزی ادب کے عظیم افسانے کا ترجمہ بھی ہے، مولانا الطاف حسین حالؔی کا تبصرہ بھی، اور اس صدی کے وسط کے عظیم ادیبوں خواجہ حسن نظامی اور ملا واحدی کی تحریروں کی جھلکیاں بھی، مزاحیہ مضامین بھی ہیں اور طنزیہ بھی، سفرنامے بھی ہیں اور انشائیے بھی، دِلّی کی داستانیں بھی ہیں اور دِل کی وارداتیں بھی۔ ان کو پڑھ کر آپ کہیں مسکرا دیں گے اور کہیں شاید آنکھوں میں نمی محسوس کریں۔

بیشتر مضامین اُردو ڈائجسٹ، سیارہ ڈائجسٹ، ریڈرز ڈائجسٹ (بین الاقوامی اُردو ایڈیشن)، ادبِ لطیف لاہور، ادیب دہلی اور مولانا محمد علی جوہؔر کے مشہور اخبار ہمدرد دہلی میں شائع ہو چکے ہیں۔ جناب مشتاق احمد یوسفی کے الفاظ میں ''یہ یادیں بڑے سلیقے اور ہنرمندی سے اس طرح بیان کی گئی ہیں کہ کہانی کا گمان ہوتا ہے۔ جزئیات نگاری میں ایک فطری سادگی اور روانی ہے۔ اسلوب سادہ، پُر تاثیر اور دِل نشین ہے''۔

''اوراقِ پریشاں'' کے پندرہ مضامین اُردو نثری ادب کی تقریباً ہر مقبول صنف کا ایک گلدستہ ہیں۔ یہ ایک قوسِ قزح ہے جس میں نثری ادب کا ہر رنگ جھلک رہا ہے۔ کوئی مضمون ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا تو کوئی ۱۹۹۳ء میں۔ ایسے عجیب وغریب مجموعہِ مضامین

کو ''اوراقِ پریشاں'' کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے، اگرچہ بزرگ شاعر جناب راغبؔ مراد آبادی کے الفاظ میں ؎

اس جنسِ گراں ارز کو ارزاں نہ کہو
ہرگز بھی کم از لعلِ بدخشاں نہ کہو
ماضی کی ہیں یادوں کے خزانے ان میں
راغبؔ انہیں ''اوراقِ پریشاں'' نہ کہو

✻✻✻✻✻

فیملی میگزین، لاہور
(۱۶/تا ۲۳/نومبر ۱۹۹۳ء)

زیرِ نظر کتاب فیروز الدین احمد فریدی صاحب کی مرتب کردہ پندرہ تحریروں کا مجموعہ ہے۔ مصنف اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور ادبی ذوق رکھنے کے علاوہ اہم سرکاری عہدوں پر بھی فائز رہے ہیں۔ ان کے انگریزی مضامین جو مختلف ممتاز پرچوں میں شائع ہوتے رہے ہیں، ایک مجموعے کی صورت میں شائع کیے جا چکے ہیں۔ وہ غالباً پاکستان سول سروس سے تعلق رکھنے والے پہلے لکھنے والے ہیں جن کی کتابیں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ زیرِ تبصرہ مجموعے میں خواجہ الطاف حسین حالی، خواجہ حسن نظامی، خواجہ محمد شفیع اور ملا واحدی جیسے عظیم و قدیم لکھنے والوں کی تحریروں کے علاوہ خود مصنف کی تحریریں بھی شامل ہیں اور اس طرح زمانہ قدیم و جدید کا حسین امتزاج اس مجموعہ میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ یہ مضامین مختلف موضوعات اور مختلف طرز نگارش پر مشتمل ہیں جن میں افسانے، جگ بیتی اور آپ بیتی کے علاوہ سفر نامے بھی شامل ہیں۔ اس کتاب کی وجہ تصنیف فیروز الدین احمد فریدی صاحب نے اس طرح بیان کی ہے:

''یہ موجودہ مصروف دور کے قاری کے لیے ہے۔ اس ادب نواز قاری کے لیے جو زندگی کے ہزار دھندوں، ہنگاموں، فکروں اور دلچسپیوں میں مشغول ہونے کے باوجود صحت مند اردو ادب کا ذوق بھی رکھتا ہے اور شوق بھی، جس کی پسند کا کینوس کسی ایک

صنف سخن تک محدود نہیں لیکن جو کم سے کم وقت اور کم سے کم قیمت میں نثری ادب کی زیادہ سے زیادہ اصناف سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔"

مصنف اپنے اس مقصد میں بہت حد تک کامیاب رہے ہیں۔ کتاب کے ہمراہ جناب مشتاق احمد یوسفی کا "حرفِ یوسفی" نہایت مختصر ہونے کے باوجود ان کے مخصوص انداز میں ایک دلچسپ اور دلکش تحریر ہے۔ کتاب کی طباعت اور کاغذ نہایت عمدہ اور سرورق دیدہ زیب ہے۔

*****

انٹرویو......۹ جون ۱۹۹۶ء

بی بی سی: ہمارے آج کے مہمان فیروز الدین احمد فریدی صاحب حکومتِ پاکستان کے ایڈیشنل سیکریٹری اور پاکستان انشورنس کارپوریشن کے چیئرمین ہیں، دوسری جانب وہ نہایت عمدہ نثر نگار بھی ہیں اور اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی لکھتے ہیں۔ فیروز الدین احمد فریدی صاحب کی ایک کتاب "اوراقِ پریشاں" بہت مقبول ہوئی ہے۔ ان کی دوسری کتاب جو حضرت فریدالدین مسعود گنج شکر کے بارے میں ہے، حال ہی میں چھپی ہے۔ اس کے علاوہ "Adventures in Self-Expression" کے نام سے ان کے انگریزی مضامین کا مجموعہ بھی کراچی سے شائع ہوا ہے۔ فیروز الدین احمد فریدی صاحب پچھلے دنوں لندن آئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ ایک جانب اعلیٰ سرکاری افسر ہیں، دوسری طرف اعلیٰ ادب تخلیق کرتے ہیں۔ کب آپ کے اندر کا افسر سو جاتا ہے؟ اور پھر آپ کے اندر کا قلم کار کیسے بیدار ہوتا ہے؟

مصنف: ہر انسان کی شخصیت کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ وہ ایک کام کر رہا ہوتا ہے تو اس کی شخصیت کا ایک پہلو ابھرتا ہے، دوسرا کام کرتا ہے تو دوسرا پہلو سامنے آجاتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو کچھ تخلیقی مادہ دیا ہو، تو وہ تخلیقی مادہ مختلف طریقوں سے سامنے آتا رہتا ہے۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے مجھے لکھنے پڑھنے کی کچھ صلاحیت دی جو کہ باپ دادا کی میراث بھی ہے۔ سعادت حسن منٹو نے اپنے بارے میں کہا تھا "جب میں

لکھنے بیٹھتا ہوں تو میری کیفیت اس مرغی کی سی ہوتی ہے جو انڈا دینے والی ہوتی ہے۔"
یہی منٹو والی کیفیت کبھی کبھی میری بھی ہوجاتی ہے۔

بی بی سی: آپ نے ابھی باپ دادا کا ذکر کیا تو اس میں اگرچہ "ماں" کا لفظ نہیں لیا لیکن وہ لفظ آپ کے ذہن میں ضرور ہوگا۔ آپ کی تحریروں میں باپ اور ماں بہت جھلکتے ہیں۔ بے پناہ عقیدت اور اس سے بھی زیادہ محبت بہت زیادہ جھلکتی ہے۔ کیا اس کا کوئی خاص سبب ہے؟

مصنف: سب سے پہلے تو یہ بھی اللہ کا کرم ہے کہ اس نے میرے دل میں اپنے والدین کی محبت ڈالی۔ دوسرے مجھے جو تربیت ملی یہ اس کا بھی اثر ہے، اور شاید یہ بھی گھٹی میں ہو کہ آپ جس خاندان میں پیدا ہوئے ہوں آپ کو اس سے محبت ہو، جس شہر میں پیدا ہوئے ہوں اس سے محبت ہو، جس ملک میں بس رہے ہوں اس سے محبت ہو، انسان کے دل میں اپنے ماں باپ کی محبت ہونا فطری عمل ہے۔ بعض لوگ اس کا اظہار کرپاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے مجھے یہ صلاحیت دی، بعض لوگ جو اپنے ماں باپ سے مجھ سے کہیں زیادہ محبت کرتے ہوں گے، وہ شاید اس کا ایسا اظہار نہ کرپاتے ہوں، لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کے دل میں بھی اپنے ماں باپ کی محبت اس سے ہرگز کم نہ ہوگی جو میرے دل میں اپنے ماں باپ سے ہے۔

بی بی سی: آپ کی زبان میں جو شگفتگی ہوتی ہے، جو دھیما پن ہوتا ہے، آپ جو سہل الفاظ چنتے ہیں، اس کی تربیت آپ نے خود کی ہے یا یہ بھی کہیں سے ودیعت ہوئی ہے؟

مصنف: وہ زبان جو میں نے اپنے گھر میں سنی وہ اس طرح میری گھٹی میں پڑ گئی، میری شریانوں میں دوڑنے لگی، میری شخصیت میں رچ بس گئی کہ مجھے اس کے اظہار کے لیے کبھی کسی خاص کاوش کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں نے جو کچھ اپنے باپ کی زبان سے سنا، اپنی ماں کی زبان سے سنا، اپنے دادا دادی کی زبان سے سنا وہی میری زبان بن گئی، اور پھر دلی کی زبان سادہ بھی تھی، سلیس بھی تھی، محبت والی بھی تھی۔ میرے اظہارِ بیان میں میری کوئی خصوصیت نہیں ہے، یہ سب اللہ کا کرم، اس شہر کا عطیہ اور اس خاندان کی

وارثت ہے جس کی وجہ سے مجھے یہ سب کچھ کسی خصوصی کاوش کے بغیر حاصل ہوگیا۔

بی بی سی :اب تک آپ کی تین کتابیں، دو اردو اور ایک انگریزی میں آچکی ہیں۔ جو لوگ اس میدان میں داخل ہوجائیں وہ پھر چین سے نہیں بیٹھا کرتے۔ آپ کچھ اور لکھ رہے ہیں؟

مصنف: جس شخص میں وہ ''منٹو کی مرغی اور انڈے والی'' کیفیت ہو، وہ چین سے تو کبھی نہیں بیٹھ سکتا۔ اس کا ذہن ہمیشہ مصروف رہے گا، اس کا ہاتھ اگر نہ بھی لکھنے پائے تو بھی وہ قلم اٹھانے کے لیے بے چین ضرور رہے گا، اور پہلی فرصت میں جو کچھ اس کے دماغ میں ہے، وہ کاغذ پر اتارنے کے لیے تیار ہوجائے گا۔

بی بی سی: آپ نثر نگار ہیں۔ اس وقت برصغیر میں جو ادب لکھا جارہا ہے، جو نثر لکھی جارہی ہے، اس کے بارے میں آپ ذاتی طور پر کیا محسوس کرتے ہیں؟

مصنف: میں اپنے آپ کو اتنے بڑے سوال کا جواب دینے کا اہل نہیں سمجھتا۔ اردو نثر کا میرا مطالعہ پاکستان کے چند جرائد اور ادبی رسالوں تک محدود ہے اور اس کی بناء پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ آج کی نثر میں مجھے وہ جان نظر نہیں آتی جو چالیس برس پہلے کی نثر میں تھی۔ اب سعادت حسن منٹو جیسی تیکھی تحریر نظر آتی ہے نہ پطرس جیسی شگفتگی اور بے ساختگی۔ نہ ابوالکلام آزاد کی پُر شکوہِ تحریر نظر آتی ہے نہ وہ سادگی جس کے لیے مولوی عبدالحق نے کہا تھا کہ ''آسان نثر کا لکھنا سب سے مشکل کام ہے۔'' یوں سمجھ لیجیئے کہ آج ہم نثر کے ایک ایسے دور میں ہیں جس کا ماضی بہت شان دار تھا اور جس کا مستقبل، اللہ نے چاہا تو بہت تابناک ہوگا، لیکن جس کا حال اپنے مستقبل کے لیے میدان تیار کررہا ہے۔

(مندرجہ بالا انٹرویو، بی بی سی لندن کی عالمی اردو سروس سے ۹/جون ۱۹۹۶ء کو پاکستان کے معیاری وقت کے مطابق، ساڑھے آٹھ بجے شب، پروگرام ''سب رس'' میں نشر ہوا۔)

پاکستان کی چاروں صوبائی حکومتوں اور حکومت آزاد جموں و کشمیر کے محکمہ ہائے تعلیم نے ''اوراق پریشاں'' کو اپنے کالجوں، سکولوں اور اداروں کی لائبریریوں کے لیے درج ذیل تفصیلات کے مطابق منظور کیا:۔		
	حوالہ نمبر	تاریخ
■ حکومت پنجاب	SO(PI)4-40/94	14-9-1994
■ حکومت سندھ	S.0(Acd-I)Acd1-5/94	4-5-1994
■ حکومت سرحد	Kcso(Trg)2-2/Books	27-9-1994
■ حکومت بلوچستان	S.O.(G)20-5/94Edn	22-1-1994
■ حکومت آزاد کشمیر	ST/Admin/43-46/94	3-1-1994

اس کے علاوہ حکومت سندھ کے محکمۂ بلدیات نے مراسلہ نمبر R.O.8(234) A(/93) مورخہ 1-7-1993 کے ذریعے، اسے کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن، اور صوبے کی تمام میونسپل کارپوریشنوں، میونسپل کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ کونسلوں کی لائبریریوں کے لیے منظور کیا ہے۔

''فرید الدین مسعود گنج شکر کی ایک جھلک''

پر چند تبصرے

پروفیسر ڈاکٹر اسلم فرخی

بیشتر کتابیں نوکِ قلم سے لکھی جاتی ہیں۔ ذہن تیاری کرتا ہے، یادداشت آبیاری کرتی ہے، منطقی ربط و استدلال رہ نما بنتے ہیں، واقعات، حالات اور خیالات قلم بند ہوتے ہیں، فکر کی نئی راہیں نکلتی ہیں، عقل کا اجالا پھیلتا ہے، لفظ و معنی کے دروبست سے علم کی توسیع ہوتی ہے مگر بعض کتابیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں شوق دل مضطرب مرتب کرتا ہے۔ عقیدت رہ نمائی کرتی ہے۔ محبت روشنی بن کر ہر ہر لفظ سے ظاہر ہوتی ہے۔ واقعات، حالات اور خیالات مجسم ہو کر نظروں میں پھرتے ہیں۔ فکر حیران اور عقل درماندہ نظر آتی ہے اور لفظ و معنی کے دروبست میں وارفتگی، سرشاری اور کیف لازوال کا احساس ہوتا ہے۔ اس وقت ایک ایسی ہی کتاب میرے پیش نظر ہے۔ نام ہے: فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کی ایک جھلک''۔ مصنف ہیں: اردو اور انگریزی کے معروف اہل قلم: فیروز الدین احمد فریدی۔

کتاب کے عنوان سے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ اولیاء قسم کی کوئی چیز ہوگی جسے ادبی اہمیت حاصل نہیں ہوتی مگر جب اس کا مطالعہ شروع کیا تو فوراً یہ احساس ہوا کہ یہ کوئی رسمی اور روایتی روداد نہیں۔ ایک پر اثر، شان دار اور اہم ادبی مرقع ہے جو ادب اور تاریخ کے تمام تقاضوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ جیسے جیسے پڑھتا گیا یہ حقیقت واضح تر ہوتی گئی کہ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کی یہ جھلک مصنف نے جس ذوق و شوق، خلوص و محبت، سلیقے اور فنکارانہ چابک دستی کے ساتھ دیکھی اور دکھائی ہے وہ چشم ظاہر کی نہیں دیدۂ بینائے دل کی مرہون منت ہے۔ فیروز الدین احمد فریدی نے یہ جھلک

خود بھی دیکھی ہے اور اپنی لذت دید میں اپنے قاری کو بھی پوری طرح شریک کرلیا ہے۔ یہ جھلک کیف میں ڈوبی ہوئی وہ روداد ہے جسے روحانی ورثے کی بازیافت ...... صحیح اور بھرپور...... عشق و آگہی کی فسوں کاری اور عظیم مقصد کی قوت، لگن اور تہہ داری سے عبارت سمجھنا چاہیے۔ اس جھلک میں ہر طرح کے جلوے ہیں، عرفان و آگہی کی منزلیں طے کرنے والے ایک نوجوان کی جھلک، پیر و مرشد کے حضور ادب و احترام سے بیٹھنے اور اکتسابِ فیض کرنے والے مرید کی جھلک جو بہت جلد مراد کے مرتبے پر فائز ہوگیا۔ اس اللہ والے کی جھلک جس کے در پر ملک کے گوشے گوشے سے طالبانِ فیض کھنچے چلے آتے تھے اور مرادیں حاصل کرتے تھے۔ اس رہ نما، مصلح، ہدایت کار اور صاحب فکر و نظر کی جھلک جس کے انفاسِ قدسیہ کی برکت سے لاکھوں انسانوں کی تقدیریں بدل گئیں۔ اس مرشد کی جھلک جس نے اپنے مریدوں میں اسوۂ محمدیؐ کی تبلیغ اور اتباع سے اہل عالم کی ہدایت و رہنمائی کی شمعیں روشن کردیں۔ اس جھلک میں ساری جھلکیاں ہیں، بہت روشن، واضح اور دلکش۔ مصنف کا کمال یہ ہے کہ اس نے بے شمار جھلکیوں سے ایک ایسا مرقع مرتب کردیا ہے جو وحدت تاثر کے اعتبار سے بڑا معنی خیز ہے۔

فریدالدین مسعود گنج شکر کی اس جھلک میں مصنف نے جابجا بڑے بلیغ اور پرکار اشارے کیے ہیں۔ اکثر مقامات پر محسوس ہوتا ہے کہ دیکھنے والا جھلک دیکھ کر بے خود ہوگیا ہے اور بے خودی میں اپنے آپ سے محو گفتگو ہوگیا ہے۔ بے خودی کی اس گفتگو میں زندگی کے حقائق کا ادراک، تجربے، فکر کی ہل چل، علم کی دیدہ وری، تاریخ کی سفاکی، روحانی برگزیدگی اور سرشاری سبھی کچھ معرض بیان میں آجاتا ہے۔ یہیں سے مصنف کے علم و دانش اور موضوع پر محرمانہ دسترس کا احساس ہوتا ہے۔

مصنف نے شوق فراواں کی اس روداد کو سرکارِ دو عالم ﷺ کے ذکر انور سے شروع کیا ہے کہ یہی وہ چشمہ ہے جس سے دوسرے تمام چشمے فیض حاصل کرتے ہیں، اور اختتامیہ ہے اس شفیق شخصیت کے نام پر جس کے پیروں تلے جنت حاصل ہونے کی بشارت سے ہم سب واقف ہیں۔ ابتدائیے کی طرح یہ اختتامیہ بھی نہایت موزوں، برمحل

اور پر تاثیر ہے۔

پوری کتاب پڑھ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایسی کتابوں کے مطالعے سے دل میں کیف و سرور اور عفت و پاکیزگی کی ایک لہر ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ تزکیہ نفس حاصل ہوتا ہے اور انسان زندگی کے مقاصد اور رفعتوں سے آشنا ہوتا ہے۔ فیروز الدین احمد فریدی کا اسلوب بیان بھی موضوع سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ موضوع کی عظمت اور دل کشی ان کے اسلوب میں بھی در آئی ہے جس کی وجہ سے اس تصنیف کو ایک گراں قدر ادبی تحفے کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ میری رائے میں اس کتاب کا مطالعہ ہر صاحب ذوق قاری کے لیے ضروری ہے۔ کتاب حسن معنی کی طرح حسن ظاہر سے بھی مالا مال ہے اور دیدہ زیب تصاویر نے اس کی خوبیوں میں کچھ اور اضافہ کر دیا ہے۔

*****

(روزنامہ نوائے وقت)

(۶ر جولائی ۱۹۹۵ء)

حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر کا شمار نامور اولیائے عظام اور صوفیائے کرام میں ہوتا ہے۔ سلسلہ عالیہ چشتیہ کے جن بزرگوں نے دینی اور روحانی خدمات، مجاہدات، تبلیغی مہمات، کشف و کرامات اور عوام و خواص کی سود و بہبود کے حوالے سے نام اور مقام پایا، بلا شبہ بابا فرید الدین مسعود گنج شکر ان میں سے ایک ہیں۔ حال ہی میں ''بابا فرید الدین مسعود گنج شکر کی ایک جھلک'' کے زیر عنوان ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں بابا صاحب کی شخصیت، کردار اور خدمات کے حوالے سے خاصا تحقیقی مواد موجود ہے۔ یہ تحقیقی کاوش نامور ادیب فیروز الدین احمد فریدی کی ہے، جنہوں نے انتہائی عرق ریزی سے تاریخ کے سمندر میں اتر کر گوہر نایاب تلاش کیے اور انہیں ایک مالا کی صورت میں پرو دیا ہے۔

فیروز الدین احمد فریدی کی اب سے پہلے دو کتابیں (ایک انگریزی اور دوسری

اردو میں) اہل علم و ادب سے داد تحسین حاصل کر چکی ہیں اور اب یہ تیسری کتاب ایک روحانی بزرگ کے حوالے سے ہے، جس کی اشاعت سے تحقیق کے بہت سے در، وا ہوں گے، اور محققین کے لیے نئی راہیں کھلیں گی کیوں کہ صاحب تصنیف نے محض عقیدت کی عینک لگا کر بابا فرید الدین مسعود گنج شکر کی شخصیت اور کردار کو نہیں دیکھا بلکہ ان کی انسانی حیثیت کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

اس کتاب میں ایک اہم نکتہ یہ اٹھایا گیا ہے کہ اگر وسیع معنوں میں دیکھا اور سوچا جائے تو پاکستان کے حقیقی بانی حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر ہیں۔ یہ بات قائد اعظم محمد علی جناح کے اس فرمان کی روشنی میں دیکھی جائے کہ ''پاکستان اسی وقت قائم ہو گیا تھا جب جنوبی ایشیا میں پہلے ہندو نے اسلام قبول کیا تھا'' تو ناقابل فہم نہیں رہتی۔ مصنف نے اسی نکتہ کو اپنے انداز میں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ''فرید الدین مسعود گنج شکر نے اپنی نوے سالہ زندگی کے بیس پچیس برس حکم الٰہی کے تحت اجودھن میں بسر کیے۔ چوتھائی صدی کے اس قیام کے دوران اس پورے علاقے میں آباد ہندوؤں کے اتنے بڑے بڑے قبائل ان کے ہاتھ پر اسلام لائے اور بعد میں مغربی پنجاب میں اتنی دور دور تک پھیلے کہ یہ علاقہ ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کی اکثریت کا خطہ ہو گیا۔ یہی عددی اکثریت سات سو برس بعد ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی واحد بنیاد بنی۔''

اسی طرح کتاب میں بہت سے اہم نکات اٹھائے گئے ہیں۔ بلا شبہ مصنف نے عالمانہ اور منطقیانہ طرز استدلال کو بروئے کار لاتے ہوئے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ ان کی علمیت کا مظہر اور تاریخی حقائق سے عبارت ہے۔ یہ عہد رفتہ کو آواز دینے کی نہیں بلکہ اسے زندہ کر دینے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔

دین اور روحانیت کی محبت اور ذوق و شوق انہیں اپنے دادا مولوی محمد عالم شاہ فریدی سے ورثے میں ملا تھا۔ جنہوں نے ''مزارات اولیائے دہلی'' لکھ کر مولانا الطاف حسین حالی سے اپنی محققانہ حیثیت کا لوہا منوایا تھا، اس ذوق و شوق کو انہوں نے اپنی محنت سے جلا بخشی ہے اور ۱۰۰ اصفحات پر مشتمل نئی کتاب لکھ کر معلومات کا خزینہ بہم

پہنچایا ہے۔ کوتاہی ہوگی اگر مصنف کے اسلوبِ نگارش کے حوالے سے بات نہ کی جائے۔ فیروز الدین احمد فریدی کی تحریر بلاشبہ بڑی رواں دواں ہے۔ اسے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ہم بہتی ندی کے ساتھ ساتھ رواں دواں ہیں۔ الفاظ سادہ اور اسلوب نرم اور مدھم ہے۔ کتاب کا پہلا باب ''ورفعنالك ذكرك'' کے زیرِعنوان ہے، جس میں سیرتِ طیبہؐ کے مختلف گوشوں کے حوالے سے بڑی بامعنی باتیں کی گئی ہیں اور پھر بابا فرید الدین مسعود گنج شکر کے حوالے سے کتاب کا ایک ایک نقش مصنف کی نفاستِ طبع کا مظہر ہے۔

توقع ہے کہ فیروز الدین احمد فریدی اپنا تحقیقی اور علمی سفر جاری رکھیں گے اور ان کی اس قسم کی خوب صورت تخلیقات منظرِ عام پر آنے کا سلسلہ اسی انداز میں برقرار رہے گا۔

*****

فیملی میگزین، لاہور

(۲۲ر جولائی ۱۹۹۵ء)

بابا فرید کے بارے میں بے شمار کتابیں اور مضامین تحریر کیے جاچکے ہیں اور یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ وہ صوفیائے کرام کی اس قبیل سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے برصغیر میں ہر قسم کی سختیوں اور مشکلوں کے باوجود اللہ کا پیغام مقامی آبادی تک پہنچایا۔ فیروز الدین احمد فریدی نے اس بابرکت ہستی کے بارے میں ایک مختصر لیکن جامع اور عام فہم کتاب تحریر کی ہے جس کا انداز دوسری تصانیف سے مختلف ہے۔ مصنف کا تعلق حکومت پاکستان کے اعلیٰ سرکاری طبقے سے ہے لیکن ذوق وشوق اور جذبہ کسی کی میراث نہیں ہوتا۔ ادب کا ذوق انہیں تحریر کے کوچوں میں لے جاتا ہے اس سے پہلے وہ ''اوراقِ پریشاں'' کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کرچکے ہیں۔ وہ اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی لکھتے ہیں اور ان کے انگریزی مضامین کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوچکا ہے۔

زیرِنظر تصنیف ''بابا فرید'' کے حالاتِ زندگی اور ان کی خصوصیات کا احاطہ کرتی ہے

لیکن اس کا اندازِ تحریر یکسر جدا اور بہت آسان اور دل نشین ہے۔ انہوں نے کہانی کے پیرائے میں اس طویل و بسیط موضوع کو مختصر سی کتاب میں یکجا کردیا ہے اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ فرید گنج شکر کی زندگی کا کوئی پہلو قاری کی نگاہ سے اوجھل نہیں رہتا۔

انہوں نے نوے برس کی عمر میں وفات پائی لیکن ایسے کارنامے سرانجام دیے جن کے لیے عمر لافانی درکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے انہیں اپنے محبوب بندوں کی فہرست میں شامل کیا۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ چالیس برس مسعود نے وہی کیا جو اللہ نے چاہا، اب جو مسعود چاہتا ہے، وہ کردیا جاتا ہے۔ ان کی ریاضت اور اللہ سے قربت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا۔

اس کتاب میں رنگین تصاویر بھی شامل ہیں۔ آخری صفحات میں مصنف نے اپنے سفر دہلی کے دوران پیش آنے والے واقعات بھی تحریر فرمائے ہیں جن میں وہاں مدفون اولیائے کرام کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ فیروز الدین احمد فریدی کا اندازِ تحریر نہایت دلکش، پر اثر اور جذبات سے بھرپور ہے۔ اس مختصر کتاب میں اتنے بڑے موضوع کو سمو دینا کوزے میں دریا بند کرنے کے مترادف ہے۔ سرورق دیدہ زیب اور کاغذ، طباعت اور پیش کش بہت عمدہ ہے۔

the leading Urdu journals of the country. Some of the articles are his reminiscences of his boyhood of Delhi, the great cultural centre of Muslims, where he was born. The articles which relate to Delhi, though autobiographical in nature, depict the Muslim culture of undivided India, and contain much that is full of anguish. His attachment to his birthplace is so great that, after 37 years, he undertakes a visit to Delhi where he got his early school education; in the silence of the night, he stands under the great '*Pipal*' tree, under whose shade, he might have played a number of games; he stares at the iron gate at the entrance of his '*MOHALLA*' lane and tries to recollect the past. He very sentimentally gives an account of the house of the first prime minister of Pakistan, Nawabzada Liaquat Ali Khan, at Delhi, which currently is the official residence of Pakistan's ambassador. While he is having his dinner in a room there with the ambassador, he recalls how fateful meetings were held in that room.

Among other articles, there is an article having very illustrative description about the erstwhile East Pakistan. The cities of Dhaka and Chittagong, the lush green forests of Sunderbans, the paddy fields, the village folks and their simple way of life, all have received equal attention by the writer. Alas! that beautiful land is no more with us, due to our own follies.

The language of the book is very impressive and chaste. Simple sentences, with appropriate phrases and idioms, have enhanced the beauty of narration and have established the author in the list of distinguished writers.

پاکستان کی چاروں صوبائی حکومتوں اور حکومتِ آزاد جموں وکشمیر کے محکمہ ہائے تعلیم نے 'اوراقِ پریشاں' کو اپنے کالجوں، سکولوں اور اداروں کی لائبریوں کے لیے درجِ ذیل تفصیلات کے مطابق منظور کیا۔

	حوالہ نمبر	تاریخ
• حکومتِ پنجاب	SO(PI)4-40/94	14.09.1994
• حکومتِ سندھ	S.O(Acd-I)Acd 1-5/94	04.05.1994
• حکومتِ سرحد	KC SO(Trg)2-2/Books	27.09.1994
• حکومتِ بلوچستان	S.O.(G) 20-5/94-Edn	22.01.1994
• حکومتِ آزاد کشمیر	ST/Admin/43-46/94	03.01.1994

اس کے علاوہ حکومتِ سندھ کے محکمہ ءبلدیات نے خط حوالہ نمبر R.O.B(234)(A)/93 مورخہ 01-07-1993 کے ذریعے اسے کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن، تمام میونسپل کارپوریشنوں، میونسپل کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ کونسلوں کی لائبریریوں کے لیے منظور کیا۔

Wahid Rasta" is a perfect piece of satire, irony and allegory, all rolled into one coherent whole.

The book, right from the start till the end, is so gripping that eminent writers like Mushtaq Ahmed Yousufi, Shanul-Haq Haqqi, Raghib Muradabadi and several others have commended it lavishly. The style is at once simple, lucid and alluring.

THE NEWS

(9th October, 1993)

Delhi is in the grip of communal violence. Sikhs and Hindus are on the rampage. This is a sequel to the partition of India. Muslims of Delhi, like other parts of India, are migrating, with their meager left-overs, to their new homeland, Pakistan. They have been penalised for their support to establish a new Muslim state on the world map. Under these circumstances, a family of six children and two widows leave their ancestral home in the predominant Muslim area of Old Delhi. They somehow manage to reach the Delhi airport, where a rickety cargo plane is standing at the tarmac to take the migrants to Pakistan. Among the six children of the family, is a boy of about 10 years, wearing a woollen overcoat, and in the pockets of the overcoat, he has stealthily stuffed his old companions: the chess-pieces. He is clutching them, and assuring himself that they are not lost. Like the other fellow-passengers, he is engrossed in thoughts about his new homeland. The boy Firozuddin Ahmed Faridi, in later years, was ***destined*** to become a distinguished personality in the bureaucracy of Pakistan.

The author of the book under review, ***"AURAQ-E-PAREESHAN"***, Firozuddin Ahmed Faridi was born, at Delhi, in the year 1937. He graduated and later did his M.A. and LLB from Karachi University, MPA from Harvard University, and M.Sc. in Defence and Strategic Studies from the Quaid-e-Azam University, Islamabad. He also did a one year diploma course in Social Policy and Administration from University College, Swansea, U.K. He has been a member of John F. Kennedy School of Government Association of Harvard University since 1977.

The book ***"AURAQ-E-PAREESHAN"*** is a collection of 15 articles written by the author on different occasions, and published in

PRESS REVIEWS ON

AURAQ-E-PAREESHAN

(17th September, 1993)

AURAQ-E-PARESHAN is not merely a collection of articles written and published in different times about persons and places, but a picture gallery. Rolling before our eyes are the life-like and life-size portraits of persons of the writer's distinguished family in Delhi. The pen portraits are so powerful that the ardent reader is transported into the author's poetic, symbolic and historic world of imagination.

The worthy son Firozuddin Ahmed Faridi has recreated the world of Delhi. His father Fasiuddin Ahmed appears to be moving before our eyes alive, in his house, his office in Hardinge Library of Delhi, much before partition of India. His absorption and devotion to work has become proverbial. Every event and incident has been written with perfection and precision, and it appears that we are witnessing every bit of that event. The scenes of parents' affection, their life and death episodes are recreated with a well of emotions and affection unlimited (if I can use the term).

Quite fascinating are the scenes of the Arabic School where the father of the learned author had spent his early days. One feels to be enjoying every part of the class and its teacher, as if something happening with him. The ardent readers are not only lost in this book, but they also participate in the author's feelings, feel with him, move, act and react with him, in all the happenings.

For lovers of (former) East Pakistan, a separate chapter provides an ample chance of enjoying the writer's line of emotions and relations with that part of our country, in the past. Different trends and shades of forms will be found in this singular volume. "*Aman Ka*

progress, we must regress in time. He suggests that we should go back to where we stood on 14th August, 1947. What the Quaid had accepted for the government service in Pakistan, we should not grudge giving back "*A reasonable opportunity of showing cause*" to the citizens of the state before imposing major penalty on them. Also, we should not be reluctant to give constitutional protection to the principle of natural justice.

Firozuddin Ahmed Faridi's nonconformist views merit close scrutiny and thorough analysis. Hopefully, our scholars and administrators would respond to his call and come out with their views on the subject and determine feasibility, or otherwise, of his proposals.

corporation as the district government, it will immediately raise the status and importance of the district. He, however, is conscious that, in this process, the interests of the provinces will be somewhat adversely affected. In this connection, he suggests that public opinion should be fully mobilised in favour of the proposed changes and the matter should be thoroughly debated in the press, the electronic media, seminars and symposia. The lead must naturally come from the leaders of public opinion. The author maintains that if would be unfortunate if this idea was not put to experimentation. He is sure that if this experiment is launched intelligently in one district in every province, or in just one district of only one province, it will arouse the curiosity among people and they will certainly respond to it enthusiastically.

The author feels that the absence of the process of accountability in Pakistan is a psychosocial phenomenon and is the outcome of cumulative effect of the centuries-old arbitrary culture of power. This culture is the product of feudalism which manifests itself in authoritarianism and exploitation.

Regrettably, the feudal outlook continues to exist even today, and is still governing the thinking and the actions of the ruling elite. We have seen repeatedly in our history that the authoritarian approach has remained unmindful of accountability. Under this system, a negligible minority retains the effective political and economic power of the state, and considers itself above law, and beyond any accountability.

As regards matters of national importance, there is a general feeling of indifference on the part of those who matter, and of helplessness among those who are nonentities. In such psychosocial environment, no person, no constitution and no law can enforce genuine accountability.

The author concludes his paper with the remarks that today we are caught in a storm, and are standing at a point where the very foundation of every institution has been badly eroded.

This is not the time to put blame on any particular individual or institution. In fact, we all are sailing in the same boat. So instead of blaming others, we should first try to put our own house in order. We should contribute our bit towards laying the foundation of a viable system of governance.

According to the author's perception, the only way to advance on this front, paradoxical though it may sound, is to retreat. In order to

personal in treatment. In a humorous tone, Firozuddin exposes the shallowness of the Western life style. The other essays are quite penetrative and deal with the process of accountability in Pakistan. These essays are well researched and provide fresh food for thought for our policy-makers.

In his first essay, ***Twilight in Delhi***, the author recounts his personal experiences of 1947. While floating in the air, on his migration from Delhi, in 1947, he went through a delirious experience. Recalling his departure from Delhi in 1947, he observes, with a touch of nostalgia, that the airport looked the same as it was in 1947. Also, the minarets of the Grand Mosque of Shah Jehan were the same -- tall, majestic, proud and erect, just as he had left them. And the evening twilight in Delhi had again the same radiance. He, however, sinks deep in grief to see that his mother and other relations who had accompanied him in 1947, were now missing. But he soon consoles himself by saying that those precious souls could not accompany him as they had already left this mortal world.

In his second essay, ***A Passage to India,*** he narrates the details of his visit to the grave of his father, buried in Delhi. In the graveyard, under the shade of a beautiful, fragrant, evergreen ***henna*** tree, whose dried leaves were used on festive occasions, lay for the past four decades, the bones and ashes of the man whose tiny baby (the author) had now grown into full bloom manhood and had come back to visit him, after almost four decades. The author narrates the details of his desperate search for locating the grave of his father in such a gripping style that the reader can hardly control his tears.

After recounting his personal reflections, the author now turns to a subject of great national importance.

He talks of professional matters. In this context, he first takes up district administration and advocates the formation of a democratic and accountable district administration through elected councils. To him, this is a bold and innovative idea and must he given a fair trial. To him, its financial implications are quite modest *vis-a-vis* its contribution towards welfare of the society. Firozuddin Ahmed Faridi is convinced that administrative implications of the proposed system would transcend district, divisional and even provincial boundaries.

He maintains that if the local councils were ever allowed to emerge as local governments, as envisaged in article 32 of our constitution, and the district council and the municipal/metropolitan

In this way, an additional amount equivalent to US$ 10 million was being shelled out by the Federal Finance ministry. The only motive behind the delaying of one day in the international tender was just to provide an opportunity to increase the price by the foreign sellers.

A lot of protests and complaints were made in this regard. Even on the floor of the National Assembly, the issue was raised by some MNAS but the government, in its usual style, issued a statement that the Prime Minister's Inspection Team has started a detailed probe into the affairs of the TCP. What actually then happened is known to all of us. The above is just only one instance referred by the author in his book, otherwise the book contains a lot more instances.

Two stories in the book, under review, are autobiographical in character and seek to review the sentimental memories of a past that contains much that is painful and full of anguish. The author, who was born in a respectable family of old Delhi, had to migrate with his widow mother and grandmother in the year 1947 in the wake of bloody riots in the Indian capital, when he was just ten years old.

After a long period of 37 years, Firozuddin Ahmed Faridi got an opportunity, when he was a matured man and holding a distinguished position in the government bureaucracy, to revisit Delhi. He revived the old memories once be was in the lanes and alleys of old Delhi. His narration of offering '*fateha*' at his father's grave and other relatives is quite touching.

On the whole, the book is quite good. It is an addition to the existing stock of memoirs, so far written in English.

THE MUSLIM ISLAMABAD

(1st October, 1993)

Firozuddin Ahmed Faridi's scholarly account ***"Adventures in self expression"*** mirrors the emotional and intellectual aspects of his personality. His articles ***Twilight in Delhi** and **A Passage to India*** are autobiographical in character and are emotionally charged. Here, he recalls memories of the past, with a touch of nostalgia. Memories of his early life are tinged with personal grief and deprivation. Gripping as they are, his reflections leave an abiding impact on the readers' minds. His essay: "***Reminiscences of a Pakistani abroad***" is also

accountability that Firozuddin tells is surely a matter to ponder over seriously.

Citing an example in one of the Federal Corporations, i.e., the TCP how a bungling took place as back as in 1985, and despite its identification by national newspapers, it was shelved only for lack of genuine willingness. The episode narrated by the author is as under:

On 11th August 1985, the Chairman of the TCP ordered his Finance Director to visit Switzerland for two weeks, and two days later he ordered his director of Imports to visit Romania and Yugoslavia for ten days. When these two directors were away, an advertisement was released, on international basis, for import of 50,000 metric tons of white sugar. International tenders were to be opened on the 2nd of Sept. '85, obviously during the absence of the two directors. Barely ten days after the issue of the international advertisement, the TCP issued, on 25th August, a corrigendum to its advertisement dated 15th August 1985, which extended the opening of the international tenders by 29 hours.

The tenders were now to be opened not on 2nd Sept '85 at 11:00 a.m but on 3rd Sept '85 at 4:00 pm. The corrigendum did not give any reason for its issue. It was just there, like an enigmatic smile on a pretty face and in the glorious traditions of the official handouts, which are not supposed to give any reason for an official act or omission. It was left to the prestigious ***Reuters*** New agency in London to do what some official agency should have done on the soil of Pakistan. In a story originating from London dated 4th Sept '85, ***Reuters*** circulated a news which found place on the front page of a commercial newspaper of Karachi, on 5th Sept '85.

Referring to the effect that the mysterious 29 hours extension by the TCP had on the international price of sugar, ***Reuters*** reported as follows:-

"London Sept 4th. The price of sugar offered to Pakistan yesterday, at a buying tender for 50,000 tonnes white, has been increased to reflect the sharp rise in world market prices."

"Pakistan's tender for Oct/Nov shipment sugar was originally scheduled for Monday (Sept '85) but was postponed until yesterday (3rd Sept '85)".

"Today the London daily spot price for white sugar was lifted by 13.50 dollars to 176.50 dollars a ton, f.o.b. as compared with Monday's level of 163 dollars."

The remaining articles, being serious and articulate, perhaps do not qualify to be adventures. This, however, does not minimise their importance since they contain, as has been said above, the fruits of experience which the author has gathered during his long service. Experience, supplemented by sincerity and commitment to the cause of Pakistan, has come out with a conviction rare, at least, in our part of the world. Decentralisation, the key to an effective administration, perhaps, could not have been better pleaded for. Same is the case with 'accountability', a word which, in our country, has sadly lost its sanctity.

Taking note of these articles by those who matter is perhaps a far cry for who else has time for such madness (the author would kindly forgive me for this 'madness'). To wish is, however, something which does not attract any penal code, however, repressive or selective it may be. So, I wish, may the feudalistic shell be broken, may the labour which Mr. Faridi and many others like him have taken and continue to take not go waste. Ameen!

THE NEWS

(23rd October, 1993)

Volumes have been said, and written, about accountability in this country. Accountability is the subject which has been in great demand since long by our politicians and the general public alike. Whenever a new set of politicians want to come into power, they vociferously assert that, after coming into power, they would do everything to usher an era of accountability and purge all the evils which are rampant among the bureaucrats and other elements of the society, but no ruling party has ever tried sincerely to enforce it.

The author of the book "Adventures in Self Expression", Firozuddin Ahmed Faridi, in the book under review, has tried to reflect the need for accountability. Actually, they reflect the writer's deep moral preoccupation with lack of accountability in our public life. In his own words, the history of accountability in Pakistan is actually the story of the absence of genuine accountability. Accountability is a theme which applies to all the spheres of public life and should concern all of us, whether administrators or not. The story of lack of

PRESS REVIEWS ON

Adventures in Self-Expression

(29th July, 1994)

Mr. Firozuddin Ahmed Faridi is certainly a man of cultivation and taste and his sincerity and commitment are of the order that arouse in the reader very genuine, involuntary feelings of appreciation for his "adventures in self expression" as contained in this book.

The sheen added to his aptitude, for expressing himself through pen and parchment, by the high positions he held in the government, is more than evident from his writings. The articles included in the book are directly or indirectly related to his career ...... and contain the fruits of experience he has gathered as a civil servant, over the years.

The article, "A Passage to India", title meaningfully taken from E.M. Foster's famous book with the same title and the small piece, in the beginning, "Twilight in Delhi", title taken from Ahmed Ali's novel with similar title, are complementary, as the one contains the account of the author's departure as a young boy from Delhi at the time of partition and the other tells us about his visit to Delhi, a couple of decades later, on some government mission. These two articles, despite being very personal — they could not have been otherwise — do not lack in their appeal, for the sentiments expressed in them could be of anybody's in similar circumstances. There are many people of the author's generation, still around, who, by reading these articles, will have their feelings aroused; nostalgia coupled with sadness, no matter whatever amount of rationale they may have for the course history had taken.

"Reminiscences of a Pakistani abroad", perhaps has more to justify the title of the book. An essay, a form which gives more room for self expression and the author coming out in his element, in this article, has exploited it for his adventure to his heart's fill.

Sallallaho-alaihay Wasallam, in a language which cannot be described in words. It can truly be appreciated by reading alone. In a nutshell, it can only be said that the account given in respect of the Holy Prophet is not only heart warming; it is also soul-stirring.

The various other chapters in the book, the narrations, the descriptions, the bibliographies are simply superb, and the overall image of the author which the book leaves over the mind of the reader, particularly the readers who have also gone through his two previous books, is that if there was something wanting in establishing the author Firozuddin Ahmed Faridi in the ranks of the renowned authors of the country, that barrier or handicap has now gone and he can now claim for himself a buoyant place among them.

Punjab and spread the light of Islam in the area which, at that time, had a large population of Hindus and non-believers. *Baba* Farid chose the place which was known, at that time, as Ajodhan. From this place, *Baba Saheb* spread the light of Islam, and over his pious hands thousands upon thousands of non-Muslims took the oath of allegiance to Islam. People from far and near came to Ajodhan and embraced Islam. Many of his disciples attained great heights in spirituality but the most outstanding disciple or "*MUREED*" of *Baba* Farid Ganjshakar was Nizamuddin Aulia whose tomb is thronged by lakhs and lakhs of people in Delhi every year, on the occasion of his "*Urs*".

The Sultans of Delhi Nasiruddin Mahmud and Ghiyasuddin Bulban were staunch devotees of *Baba* Friduddin Masood Ganjshakar. They always sought his blessings; Sultan Ghiyasuddin Bulban used to present himself barefooted at the '*Aastana* ', of *Baba* Farid.

Baba Farid Ganjshakar was a poet of very high standard in Persian. His mystic poems kindle the love of Allah and the love of His Holy Prophet in the hearts of the readers. The verses are beacons of light for those who cherish nearness of Allah. *Baba Saheb* also said verses in Multani dialect and in Urdu.

According to a research work conducted by the noted Urdu scholar, Molvi Abdul Haque of *Anjuman Taraqquie-e-Urdu*, the first Urdu verse was said by none else than the great saint *Baba* Farid himself which is as under:

"Waqt-e-saher waqt-e-munaja'at hai"
"Khez dara'an waqt kay barka'at hai."

It means; Rise up from your beds to offer prayers early morning because that is the time when your prayers have an easy access before Allah the Almighty. He accepts and grants your wishes and prayers.

Another very interesting revelation in the book, which the author has made, is that the most sacred book of the Sikhs "Guru Garanth Saheb", contains one hundred and twelve '*ashlokes* ' (verses) which were said by *Baba* Farid Masood Ganjshakar, (*R.A*). These verses are of high class mystical value. These '*ashlokes* ' are till today recited by the Sikhs very reverently.

Besides a lot of fine points of the book under review, the most noteworthy factor is the rich tributes paid by the author in the introductory chapter which is entirely devoted to the greatest benefactor of mankind, the last Prophet of Allah, *Hazrat* Mohammed,

PRESS REVIEWS ON

Fariduddin Masud Ganj-e-Shakar

THE NEWS

(22nd March, 1995)

Little could have I imagined when I wrote down two reviews on the books, "Auraque-e-Pareeshan" and "Adventures in self expression", in the columns of this paper in October, 1993 that Firozuddin Ahmed Faridi, the author of the above two books and of the present book under review "Fariduddin Masood Ganjshakar (R.A)" also had, in his personality, a hidden theosophist and an up to date sufi, having profound respect and understanding for the "*Aulia-e-Karam*" who lay eternally sleeping under the soil of this sub-continent.

The book under review, "Fariduddin Masood Ganjshakar (R.A)" is a biography of the great Muslim saint, Baba Fariduddin Masood Ganjshakar, (R.A) who now sleeps peacefully at his eternal abode in Pakpattan.

BABA Fariduddin Masood Ganjshakar, (R.A) was a saint extraordinary and nobody knew the spiritual heights of the *Baba*, though a number of miracles and supernatural events are said, and attributed, to have happened, at his behest.

It is said that *Baba* Fariduddin Ganjshakar gained the ascendancy in spiritual field from two great saints simultaneously. One was his mentor *Hazrat* Bakhtiar Kaki *Rahmatullah Alaihe* and the other was the most reverend saint Khawaja Moinuddin Chishti *Rahmatullah Alaihe*. Khawaja Qutubuddin Bakhtiar Kaki (*R.A*) has his tomb in Delhi, while Khawaja Moinuddin Chishti's (*R.A*) tomb is in Ajmer. People from all over the sub-continent, of different castes and creeds, still hold in great reverence these two saints and go to offer "*Fateha*" and pay their homage every year at their tombs.

The "*Pir-o-Murshid*" or mentor of *Baba* Farid, *Hazrat* Khawaja Qutubuddin Bakhtiar Kaki ordered his disciple to go to the